خمستاں

از صہبائی

قیمت فی جلد عہ

تصحیح

خمستان میں کچھ کاتب صاحب کی اور کچھ میری غلطیاں رہ گئی تھیں۔ علامہ کیفی دہلوی نے ازراہِ کرم مجھے میری بعض غلطیوں سے آگاہ فرمایا۔ اور بعض مقامات پر علامہ موصوف نے خود ہی ترمیم بھی فرمادی ہے جس کے لئے میں علامہ موصوف کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ علامہ موصوف نے اپنے مقدمہ میں بھی میرے بعض اشعار کا کسی قدر ترمیم کے ساتھ حوالہ دیا ہے۔ میں نے ان کے ترمیم کردہ اشعار کو بجنسہٖ شائع کردیا ہے۔ تاکہ اس کے متعلق دیگر صاحبانِ ذوق بھی مشورہ دے سکیں۔ ناظرین ازراہِ کرم مندرجہ ذیل مقامات پر ترمیم و تصحیح فرمالیں ؎

صفحہ	شعر	مصرعہ	ترمیم شدہ صورت
۱۹	۵	۲	یہ بے وفا کسی کا نہ ہوگا، نہ ہوسکا
۲۰	۲	۱	دیر و حرم سے بے نیاز اب ترا آشنا ہوا
۳۳	۶	۱	کاش! آغوشِ شوق ہو تیری!
۷۷	سطر ۱		دہر گزہوش میں لیکن ازل کے میگسار آئے
۷۸	۱	۲	ہزاروں آرزؤں کو بھی ساحل پر آثار آئے
۱۰۱	۶	۲	طور بھی، نورِ برقِ طور بھی تھا
۱۰۸	۴	۲	قطرے کو دل کے سمندر میں فنا ہونے دے
۱۱۵	۴	۱	ہے سایۂ سکوت کوہ و بن میں
۱۳۴	۴	۲	ہو رہا ہے خلد سے دنیا پہ بارانِ بہار
۱۶۱	رباعی ۶	۳	اک خواب پر آشوب ہے اندوہ خزاں

۲۱۰	قطعہ ۱	۱	اب کسی پہلو مرے دلمیں خوشی آتی نہیں
۲۱۰	″ ۲۳	۲	ہر بات پہ اک آہ ہے، ہر ذکر پہ اک اشک
۲۱۴	″ ۲۹	۴	یہ گیت خوشی کے مرے سب گائے ہوئے ہیں
۲۳۱	شعر ۶	۱	کیا نہ ہوگا اب کبھی بارانِ الطاف وکرم !
۲۵۸	″ ۵	۲	گو مٹ گئے ہم تو اس دل لگی میں !
۲۷۵	″ ۱۱۱	۱	تری آغوش اک راحتکدہ ہے جانِ مضطر کا
۲۷۵	″ ۱۱۲	۱	مری تخئیل کی رنگینیاں ہیں صبح خنداں میں

ترتیبِ کتاب

صفحات

انتساب

جرعۂ مے ... ... از حضرت علّامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ ... ۱ تا ۸

سرودِ مستاں ... از حضرت علّامہ کیفیؔ دہلوی مدظلہٗ ... ۹ ،، ۲۴

ہا و ہُو ... ...

تجلیات (غزلیات) ... ... ۱ سے ۸۵

سمن زار

کسی کے خیال میں ۸۶

صبح و شام ۸۹

آرزو ۹۰

تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں ۹۱

لطفِ سحر ۹۴

افکارِ پریشاں ۹۶

تسکینِ دل ۹۹

یادِ ایام ۱۰۰

افسردگی ۱۰۲

دلِ نامراد ۱۰۳

دعا ۱۰۵

خارِ تجسس ۱۰۸

بزمِ دوشیں ۱۱۰

عنوان	صفحہ
ناکامِ محبت	۱۱۱
پیا اور پیاساقی	۱۱۳
برسات	۱۱۵
چاند اور سمندر	۱۱۷
حسن	۱۱۹
پیالۂ چا	۱۲۱
تاروں بھری رات	۱۲۳
پھول اور ستارہ	۱۲۶
شبابِ کیف آفریں	۱۲۸
ستارۂ صبح	۱۳۰
خمستانِ بہار	۱۳۲
نغمۂ بہار	۱۳۴
کائنات اور انسان	۱۳۷
محبت اور موت	۱۴۰
درسِ عمل	۱۴۱
عالمِ افسردگی	۱۴۲
ذوقِ نظارہ	۱۴۴
جامِ صہبائی (رباعیات)	۱۴۵ تا ۲۰۱
راحت کدہ	۲۰۳ تا ۲۵۸
ستارے (متفرق اشعار)	۲۶۳ تا ۲۷۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارمغانِ محبت بہ بارگاہِ رحمت

اے میری روح کی راحت! تیری زندگی میرے لئے شادمانیوں اور مسرتوں کا سرچشمہ تھی، اور اب تیری ابدی جدائی تزکیۂ روح کا باعث ہے، اسلئے میں ان اوراقِ پریشاں کو جو میری حیاتِ ناکارہ کا حاصل ہیں تیرے ہی محبوب نام سے منسوب کرتا ہوں،

داغہائے فرقت کے چند پھول، اشکہائے محبت کے چند موتی اور سازہائے غم کے چند نغمے انتہائی خلوص و نیاز کیساتھ تیرے حضور میں لایا ہوں انکو قبول فرما

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست!
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

سرشارِ محبت صہبائی

از حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ایڈیٹر "معارف" اعظم گڑھ یو۔پی،

کشمیر کے دست فیض نے نہ صرف خطۂ کشمیر کو رشک گلزار بنا دیا ہے، بلکہ جہاں جہاں بہار و خزاں کے انقلابات نے اسکی شاخوں اور ڈالیوں کو اڑا کر پہنچا دیا، ہر جگہ ایک نیا چمن لگا دیا، اور نیا گلشن کھلا دیا۔ پنجاب کی ہمسایہ زمین قدرتاً اسکا زیادہ حق رکھتی تھی، اور اسی لئے وہیں کے سرسبز و شاداب قطعوں نے سب سے زیادہ ان "خانہ برانداز چمن" کو اپنے آغوش میں لیکر انکی آبیاری کی، اور پورے پنجاب کو اپنی نکہت بیزیوں سے گلکدہ بنا دیا۔

پنجاب میں سیالکوٹ کشمیر سے قریب تر ہے اور یوں بھی علم و ادب اور فضل و کمال کا ہمیشہ سے گہوارہ ہے ملا عبد الحکیم سیالکوٹی جن کو دو دفعہ شاہجہان کی قدردانیوں نے چاندی میں تلوایا۔ اور ہند سے لیکر مصر تک ان کی تصنیفات نے اپنا سکہ بٹھایا۔ وہ اسی خوش سواد شہر کی خاک سے اٹھے تھے۔ اور اس عصر جدید میں اقبال سا فلسفی اور شاعر پیدا کرنے پر اس کو بجا طور سے فخر و ناز ہے اور یہ مرغ خوشخواں بھی اسی "ملک جنت نظیر" کے باغوں سے اڑ کر یہاں تک پہنچا ہے۔

اس "خمستان" کا ساقی بھی اسی میکدہ کا "صہبائی" ہے۔ ان کے والد ماجد مولوی احمد دین صاحب پال جماعت اہلحدیث میں ایک ممتاز اور فاضل بزرگ ہیں۔ انہی کی مذہبی آغوش میں عبد السمیع پال اثر صہبائی

نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کو آنکھیں کھولیں، تعلیم کی ابتدائی منزلیں درجہ بدرجہ طے ہو کر ایم۔ اے پر جا کر ختم ہوئیں اور فلسفہ کی سند یونیورسٹی سے حاصل کی۔

صہبائی نے گو اہلحدیث گھرانے میں ولادت پائی، تاہم شاعری کی دولت سے انکو محرومی نہیں ہوئی۔ خدا جانے ان دو واقعوں نے کیونکر شہرت پائی ہے کہ شیعہ حافظ، اور اہلحدیث شاعر نہیں ہوتے۔ اتنا تو سچ ہے کہ اہلحدیث میں حکیم مومن کے سوا کوئی دوسرا مشہور اردو شاعر نہیں ہوا حکیم مومن اعلانی غیر مقلد اور اہلحدیث میں ہیں صاف کہتے ہیں ؎

ارباب حدیث کا میں زہا بنر ہوں — تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روائت ائمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط سلیع پیغمبر ہوں

خالص ہوں محمدی، مرا دین اسلام — گو رائے صواب ہو، نہیں مجھکو کام
تقلید کی ٹھہری تو بنوں گا شیعہ — کس واسطے چھوڑ دیجیے افضل تر امام

کہتے ہیں ہمارے مخدوم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر اہلحدیث نے بھی اس شہرت کو ترقی دینے میں عملاً پوری کوشش کی ہے۔ لیکن میرا جواب یہ ہے کہ چونکہ وہ متبع سنت ہیں اسلئے صحیح شعر کے نہ کہنے میں بھی سنت سنیہ کی تقلید کرتے ہیں۔ ما علمناہ الشعر وما ینبغی له۔

بہرحال" پدر اگر نتواند پسر تمام کند" نوجوان صہبائی نے بڑے بوڑھوں کی عزت رکھی ہے۔ اور اپنی شاعرانہ خداداد طبیعت سے بے بنیاد شہرت کی بیخ کنی کی ہے۔

صہبائی کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں، انکا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالہ و شیون سے معمور ہے۔ چند سال ہوئے کہ ان کی رفیقۂ حیات نے انکو دائمی الوداع کہا، اس حادثہ نے انکو اور نازک دل شاعر بنا دیا۔ جہاں ذرا ٹھیس لگی، اور بلبلا اٹھے، اسی لئے ان کی شاعری میں سرور و شادمانی نہیں، بلکہ حزن و ملال ہے۔ اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ بلکہ صبر و سکون اور تسلی و تعزیت کے غمگین فلسفیانہ اشارات ہیں۔ اور ان کی غزلوں میں محبت کے سراپا اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق و محبت کے حکیمانہ رموز و اسرار فاش ہوتے ہیں۔

صہبائی کا یہ مجموعہ کلام تجلیات، بہمن زار، جام صہبائی، راحت کدہ اور ستارے پانچ عنوانوں پر منقسم ہے تجلیات میں غزلیں، بہمن زار میں مختلف عنوانوں پر نظمیں، جام صہبائی میں رباعیات، راحت کدہ میں مرثیہ، سوز و گداز اور

فنائے عالم کے تاثرات ہیں۔ اور ستارے میں ایک ایک شعر کی مختلف فردیں ہیں۔

شاعر کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اسکے دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور بوڑھے سعدی کے بقول "ہر کس را فرزند خویش بجمال و عقل خویش بکمال می نماید" ہر شاعر کو اپنے معنوی فرزندوں سے اسقدر الفت و محبت ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک کو بھی اپنے قلم سے مٹانے میں ایک فرزند کے قتل سے کم غم محسوس نہیں کرتا تاہم ایک دانشمند باپ کا فرض یہ ہے کہ اپنی اولاد کے حسن و قبح سے کما حقہٗ واقف ہو چنانچہ دانشمند صہبائی نے اپنے کلام کے وافر ذخیرہ سے انتخاب میں اپنے جلنتے پوری "بیدردی" سے کام لیا ہے اور انہی چیزوں کو اسمیں جگہ دی ہے جو ان کے معیار تنقید پر پوری اتر چکی تھیں معلوم ہوگا کہ غالب نے اس بھی زیادہ "بیدردی" کا ثبوت دیا ہے اور اپنے پورے ضخیم اردو دیوان سے صرف چند جزو پر قناعت کی ہے اور پھر سنا ہے کہ اس قتل عام کیلئے انہوں نے اپنے سنگدل دوستوں کو متعین کیا تھا۔ اور خود دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے رہے ہے لیکن آخر انہی چند اوراق نے وہ مقبولیت پائی جو سات آٹھ آٹھ دیوانوں کے مالکوں کو بھی نصیب نہیں۔

میری رائے ہے کہ ہمارے نوجوان شاعروں کو اپنے کلام و دواوین کی اشاعت میں اسوقت تک تاخیر کرنی چاہیے جبتک کلام کی صحت کا ہر طرح یقین نہ ہو جائے۔ شراب جسقدر پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پرجوش اور باکیف ہوتی ہے۔

پنجاب کے بہترین فارسی شاعر گرامی کا کلام انکے مرنے کے بعد مرتب ہوا۔ پنجاب کے بہترین شاعر ملکہ استاد فن شاعر ظفر علیخان کا مجموعۂ کلام ہنوز منتشر و پراگندہ ہے۔ پنجاب بلکہ ہندوستان کے حکیم شاعر اقبال کا کلام انکی کتنی عمر میں جا کر مرتب ہوا۔ شاد عظیم آبادی کا پورا دیوان انکے دوستوں اور شاگردوں کے پورے اصرار کے باوجود ان کے مرتے دم تک مرتب نہ ہو سکا۔ ہمارے کہنہ مشق استاد شاعر ریاض کا خمکدہ ابھی تک رندان سخن کی محفل میں نہیں پہنچ سکا مقصود یہ ہے کہ کلام کا فن کے معیار پر پورا اترنا اور بار بار کے حک و اصلاح کے بعد اسکا اغلاط سے پاک ہونا اسکے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارے نوجوان شاعر تھوڑا صبر و انتظار سے کام لیں کہ اصل کمال استعجال شہرت نہیں، بلکہ دوام شہرت ہے۔

صہبائی کی عمر اسوقت ۳۲ برس کی ہے بچپن سے شعر کہتے ہیں، اور اپنے ہموطن شاعر اقبال کے کلام کو ہمیشہ غور سے پڑھتے رہے ہیں، اور خیام و حافظ کا کلام بھی ان کے مطالعہ میں رہا ہے، اور میر و غالب کی زبان اور طرز بیان سے بھی متاثر ہوئے ہیں، میری رائے میں صہبائی میں استاد شاعر ہونیکے بجائے حکیم شاعر ہونے کی صلاحیت زیادہ موجود ہے، انکے الفاظ میں شیرینی اور ترکیبوں میں فارسیت کی پوری چاشنی اور ساتھ ہی ان کے خیالات کے بازوؤں میں معانی بلند تک پرواز کی پوری قوت ہے، اور ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انکی غزلوں سے انکی رباعیاں اور قطعات زیادہ باکیف، زیادہ پر معنی اور زیادہ موثر ہیں۔

ہندوستان کے نوجوان شاعروں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک شاعری صرف غزل گوئی کا نام ہے۔ جس شاعر کو دیکھئے کسی فرضی معشوق کے وہمی عشق میں مبتلا ہے نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کے دیگر اصناف گویا ہماری نئی شاعری سے فنا ہوتے ہیں، پنجاب میں پورا استاد اور کامل الفن شاعر جسکی شاعرانہ پختگی، قدرتِ کلام اور بدیہہ گوئی کی مثال اسوقت نہ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان میں نہیں مل سکتی، وہ ظفر علی خاں ہیں، وہ ہر صنف پر یکساں قادر اور سخنوری کے ہر فن میں کامل ماہر ہیں۔ ان کے سوا پنجاب کے صرف ایک نوجوان شاعر کا نام ہم کو معلوم ہے جس نے غزل گوئی کے کوچہ سے الگ اپنی شاہراہ نکالی ہے، اور وہ حفیظ جالندھری ہیں، مثنوی کی جو بحر انہوں نے اپنے شاہنامہ کیلئے اختیار کی ہے، وہ گو قدما کی تقلید سے آزاد ہے مگر واقعات کے نظم کے لئے انکو ایسی ہی کسی بحر کی ضرورت تھی، اغلاط سے گو وہ خالی نہیں، تاہم میں انکے جوشِ بیان اور شاعری میں واقعہ نگاری کی قوت کا قائل ہوں، اور مثنوی گوئی کے لئے اسی ملکۂ تامہ کی ضرورت ہے۔۔

صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے غزلیں، قطعات، رباعیات، مثنویاں سب کچھ کہی ہیں، اور صرف غزل گوئی کے تنگ کوچہ میں مقید نہیں، تاہم ہر شخص ہر صنف کلام پر یکساں قادر نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ، جیسے فارسی میں سعدی اور اردو میں سودا، حالی اور ظفر علیخاں، میرے خیال میں صہبائی کی فطری شاعرانہ استعداد کا اصل جلوہ گاہ انکی رباعیات ہیں۔ اور انکو اسی حیثیت سے شاعروں کی صف میں ممتاز جگہ دیجا سکتی ہے رباعی گوئی کیلئے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو، ترکیبیں چست اور رواں ہوں، اور پہلے مصرعہ سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ میں پورا زور نمایاں ہو جائے۔ یہ تو لفظی خوبیاں ہیں، معنوی خوبی یہ ہے کہ اسمیں بلند حقائق اور معانی ادا ہوں، صہبائی کی رباعیات میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:۔

ممتاز ہے شانِ ارجمندی میری — ہے رشکِ عرش، سربلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یارب — نازاں ہے بہت نیازمندی میری

اک نقطۂ موہوم ہے ہستی میری — لیکن ہے عجیب چیز مستی میری
چھوڑا جو خدا تو خود پرستی ہے اثر — جاتی ہے کہیں یہ بت پرستی میری

افسانۂ درد ہے کہانی میری — عنوان ہے خوں نابہ فشانی میری!
ہوں تیشہ بکف مثالِ فرہاد اثر — اک کوہِ گراں ہے زندگانی میری!

بیگانۂ ہوش ہوں کہ ہشیار ہوں میں — ہوں عالمِ خواب میں کہ بیدار ہوں میں
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو! — مجبور کو وہم ہے کہ مختار ہوں میں

ساغر مے عیش سے کبھی بھرتا ہوں — انجامِ بہار سے کبھی ڈرتا ہوں!
تقدیر ہی یوں تو کارفرما ہے اثر — محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں کرتا ہوں!

کیا خوب کہا ہے:-

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر — اے ننگِ جہاں روح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہِ ہستی میں بقا — کھا زخم پہ زخم، اور فریاد نہ کر

ہنگامۂ معصیت ہے ہنگامِ شباب — پیری میں ہے آہِ سرد اور چشمِ پرآب!
ہے خواب ہی خواب میں یہ ساری تگ و دو — آغاز بھی خواب ہے، اور انجام بھی خواب

گل تیرا، نہ باغباں، نہ گلشن تیرا! — تیرا ہی دلِ زار ہے دامن تیرا!
اغیار سے کیوں ہے تجھکو امید و ہراس — تیرا کوئی دوست ہے نہ دشمن تیرا

بہت ہی خوب ہے:-

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا — ظاہر ہے کہ ایک روز مرنا ہوگا
لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل — کیا ڈوب کے مجھکو پھر ابھرنا ہوگا

مدت ہوئی زخم دل پہ کھاتے کھاتے	اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اثرؔ	آتا ہے قرار دل کو آتے آتے

غزل میں بھی صہبائی کا مطمع نظر بلند ہے۔ تیرؔ کے اوزان اور رنگ تغزل میں بھی کبھی کبھی کہتے ہیں۔ اور کہیں کہیں خوب کہہ جاتے ہیں۔

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا بھی اک درد بھرا افسانہ ہے
برگشتہ قسمت والوں کا سنئے کعبہ نے بتخانہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں انکے، یا موت ہے یا پیمانہ ہے
ہر شاخ جب اک مستانہ ہے ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توبہ! ایسے میں توبہ!! جب فطرت خود میخانہ ہے
کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے، میخانہ ہی کاشانہ ہے

اسی غزل کے بعض شعر ایسے ہیں، جو گو فصیح ہیں، مگر ذرا سے الٹ پھیر سے فصیح تر ہو جا سکتے ہیں، مثلاً۔

گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، رحمت بن بن کر چھائی ہیں
آباد ہوئے ہیں مے خانے، سجدے میں ہر اک مستانہ ہے

پہلا مصرعہ اس طرح ہوتا تو اور اچھا ہوتا۔ ع

گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، اور رحمت بن کر چھائی ہیں

اسی میں ایک اور شعر ہے:۔

کعبے میں یا بتخانے میں، یہ بات کہاں میخانہ کی!
جو کام ہے آزادانہ ہے جو بات ہے بے باکانہ ہے

لہ یہاں "بھی" غالباً غلط چھپ گیا ہے "بھی" کے بجائے شاید "ہی" ہوگا۔ س

پہلے مصرعہ کو یوں کہا ہوتا تو صاف ہوتا۔ ع

کعبے اور بتخانے میں یہ بات کہاں میخانہ کی!

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:۔

یوں دادِ وفا کی ہوتی ہے، یوں مر کے ہولے مرتے ہیں
اک داغ سا شمع کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے!

شعر خوب ہے مگر اک ذرا سا تغیر اسکو کتنا صاف بنا سکتا ہے:۔

یوں دادِ وفا کی ملتی ہے، یوں مر کے ہوا سے مرتے ہیں
اک داغ سی شمع کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے!

مقطع ہے:۔

برسات کی چاندنی راتوں میں، دیکھے تو کوئی صہبائی کو
لب پہ بھی مناجاتیں لاکھوں، ہاتھوں میں بھی پیمانہ ہے

دوسرا مصرعہ ذرا سا تغیر طلب ہے:۔ ع

لب پر بھی مناجاتیں لاکھوں اور ہاتھوں میں پیمانہ ہے

مولانا حالی کا ایک بے نظیر شعر ہے:۔ ؎

اسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

صہبائی کی ایک غزل کا یہ شعر اسی کے قریب قریب ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا کے یہاں سادگی کا حسن ہے اور صہبائی کے یہاں رنگینی کا بانکپن:۔ ؎

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جانِ بہار!
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے!

مگر اس کے بعد ہی ایک شعر ہے ؎

پھونک ڈالے گا مرے دل کو مری ہستی کو
حسن اک شعلۂ لرزاں نظر آتا ہے مجھے!

"لرزاں" کی جگہ اگر "سوزاں" ہوتا تو کیا ہوتا۔

تیسرا شعر ہے اور بہت ہی اچھا ہے، اور غالب کی "زود پشیمانی" سے کم نہیں:۔

اب پشیماں ہوں میں تاثیرِ فغاں سے یارب
حسنِ مغرور پشیماں نظر آتا ہے مجھے!

پہلا مصرعہ اگر یوں ہوتا تو اور فصیح ہو جاتا۔ ع
اب پشیماں ہوں تاثیرِ فغاں سے یارب

صہبائی نے غالب کی غزلوں پر بھی غزلیں کہی ہیں اور اس مقابلہ میں بعض بعض شعر خوب نکالے ہیں،

زندگی کا رازِ عشقِ بادیہ پیما سے پوچھ — حسن کیا جانے کہ وہ خلوت نشینِ محمل ہے
موجِ طوفاں خیز میں ہے اضطرابِ زندگی — اور سکونِ مرگ ہم آغوشیِ ساحل میں ہے

ایک جاں پر ہزار ہا آفت — پھر بھی شکرِ خدا کرے کوئی
نظرِ شوق تجھکو ڈھونڈتی ہے — دیر و کعبہ کو کیا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ حسن — لیکن نگاہِ شوق تو پیدا کرے کوئی

ہم نے صہبائی کے کلام کے جو چند نمونے پیش کئے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ صہبائی کی شاعری میں رنگِ شاعرانہ نہیں، انکے خیالات زیادہ تر فلسفیانہ ہیں۔ اسی لئے رباعیات ہوں یا غزل، مراثی ہوں یا مناظر، ہر رنگ میں انکا فلسفیانہ خیال جھلکتا اور حکمت کا ساغر چھلکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اہلِ ملک انکی قدر کرینگے۔ اور اپنی حوصلہ افزائیوں سے ان کو مزید ترقی کا موقع دیں گے۔

از حضرت علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی مدظلہٗ

شاعری کی جامع و مانع تعریف کیا ہے، اور شاعر کسے کہتے ہیں؟ اس جھمیلے میں قارئین کرام کو نہیں ڈالا جائے گا۔ کیونکہ شاعری ایسا موضوع ہے جسکی تعریف ہر ادیب نے اپنے مذاق، پسند اور منطق کے مطابق کی ہے۔ عزیزی، محبی اثر صہبائی کے کلام کی تقریب اور عام طور پر سمجھانے کی غرض سے کہہ سکتے ہیں کہ:-

جذبات و احساسات عائدہ کا ایک خاص دلآویز اور موثر طریق سے اظہار و استشہاد قوت متخیلہ کا بذریعہ الفاظ و استعارات خاصہ جوش میں لانا اور قدرتی مناظر کا دلچسپ و موثر احضار شاعری ہے۔

اگر اس تعریف یا معیار کو سامنے رکھ کر خمستاں کا موازنہ کیا جائے تو اس کے ہونہار مصنف کا کلام جو اس مجموعے میں ہے قاری سے خراج تحسین طلب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اثر صہبائی عالم اردو میں شہرت رکھتے ہیں۔ اکثر مقتدر رسالے ان کے محاسن طبع سے مزین ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری کے متعلق اکثر مؤقر جرائد میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے دونو تخلص اسم بامسمیٰ ہیں۔ کیونکہ ان کا کلام اثر کا مجسمہ اور جوش کا مخزن ہے۔ ان کے ہاں شوکت الفاظ کا جادو بہت کم ملیگا۔ بیان کی برجستگی۔ ادا کی موزونیت۔ تخیل کی علوئیت اسلوب کی چستی، جذبات کی معصومیت اور تزکیۂ احساسات ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ میں انہیں برسوں سے

جانتا ہوں ۔ یہ شعر بالجبر نہیں کہتے ۔ جب تک وجدان سلیم اور طبیعت کی اُپج کی تحریک نہ ہو انکا
قلم نہیں چلتا ۔ اسی لئے ان کے کلام میں تصنع اور آورد کا نام نہیں ۔ طبیعت خارجیت سے مانوس
نہیں ۔ اثر صہبائی نے فطرۃً ایسا ذہن پایا ہے جو نقالی سے نافر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ داخلیت کو ان
کے رشحاتِ طبع سے بنائت قریبی اور اصلی وابستگی ہے ۔ تکلف اور بلند آہنگی سے ان کا کلام
آشنا نہیں ۔ جو آجکل کی بدمذاقی کے زمانے میں اعلیٰ درجہ کے محاسنِ کلام سمجھے جاتے ہیں ۔ اگرچہ یہ
فلسفہ میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں اور فلسفہ میں ان کو بے حد کا شغف ہے لیکن
"فلسفیانہ" تصنعات اور مسائلِ حکیمانہ کی ٹھونس ٹھانس اور تخیل کی ژولیدگی ان کے کلام میں تداخل
پیدا نہیں کرتی ۔ اجتہادی تیور اور رعونت کی ادائیں کہیں نہیں پائی جاتیں ۔ اسکی وجہ وہی طبیعت
میں داخلیت کی سرایت اور صالحانہ فروتنی کا شعارِ زندگی ہے ۔ ولولے اور بلند ارادے کس کے دل میں
نہیں اُٹھتے لیکن سلیم الطبع انسان خود شناس ہوتا ہے ۔ وہ اپنی شخصیت کو اُن کے نشہ کی ترنگ میں محو نہیں
ہونے دیتا ۔ وہی شاعر کے کلام کا تار و پود وارداتِ قلب سے وجود پاتا ہے ۔ مفروضات ذہنی اور مستعار اشیاء
سے نہیں ۔ ان کے کلام میں ولولوں کا جوش و خروش اور چہل پہل کی گہما گہمی بھی ہے اور یاس و حسرت کا
سوز و گداز بھی لیکن یہ سب اصلی معلوم ہوتے ہیں ، مستداخلی یا بناوٹی نہیں ۔ اسکی تصدیق اول تو ان کے لفظ لفظ
سے ہوتی ہے اور دوسرے ان مکروہاتِ دنیا سے جن سے کوئی نہیں بچ سکتا جب سے ان کی رفیقۂ حیات نے
دائمی جدائی کا داغ دیا انکا جی بجھ گیا ہے ۔ مزاج کی صلاحیت اور معصوم زندگی ، اس روحانی تعلق کی استواری اور
اسکے نغمۂ سرمدی میں کسی نئے حادثہ کو خارج نہیں ہونے دیتی لامحالہ یہ بخار کلام میں پھوٹ نکلتا ہے ۔ اگر وہ شاعر
نہ ہوتے اور ایسے شاعر نہ ہوتے جیسے کہ ہیں تو تعجب نہیں کہ یہ کیفیت مرض کی شکل نہ اختیار کر لیتی ۔ اثر صہبائی کو
اس سے کچھ ڈھارس ہوتی ہوگی اور دل کی بھڑاس تھوڑی دیر کے لئے نکل جاتی ہوگی لیکن اس کا اثر جو ان
کے محبوں ہی پر نہیں عام قارئین پر ہوتا ہے حسرت انگیز ہے ۔ خمستان کا وہ حصہ جسکا عنوان راحت کدہ ہے
اس کیفیتِ قلب کی مثال ہے ۔ اگر نام کی رعایت مدنظر نہ ہوتی تو ضرور اس حصہ کا عنوان حسرت کدہ ہوتا ۔
یہ شعر نہیں دل جگر کے ٹکڑے ہیں جو سچے اور صادق دل سے نکل کر شاعر کی زبان سے کاغذ پر آگرے ہیں ۔

اسے توفیقِ ایزدی سمجھئے کہ اس دل کی ٹھیس نے زمزمۂ میری کو بیتابانہ کر دیا ۔ راحتکدہ میں خصوصی
طور پر اور دوسری جگہ عموماً سیرِ مغفور کا درد انگیز رنگ ان کے کلام میں پھوٹ نکلتا ہے ۔ جو دلوں پر اثر کئے
بغیر نہیں رہتا ۔ یہ اشعار خود شاعر کے الفاظ میں "داغہائے فرقت کے چند پھول ، اشکہائے محبت کے

چند موتی اور ساز ہائے غم کے چند نغمے ہیں،
کہتے کہ اب عبدالسمیع صہبائی نذر ہے، محض اثر رہ گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو سکون قلب اور صبر جمیل عطا فرمائے!

حمستان کا پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جسے تجلیات کہا گیا ہے۔ یہ نام مصنف کا وضع کیا ہوا نہیں۔ بلکہ اسے بعض رسائل نے ان کی غزلوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ غزل کی نسبت یہ ماننا پڑیگا کہ یہ صنف تمام اصناف شعر میں محض مبتدیوں کی مشق کے لئے وضع کی گئی تھی۔ موضوع کا تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے مبتدی کو شعر کہنے میں مقابلۃً سہولت ہوتی ہے۔ لیکن اساتذہ نے جداگانہ موضوعوں کے اعتبار سے غزل کے رتبہ کو جس بلندی پر پہنچا دیا۔ بیان کا محتاج نہیں۔ غزل اپنے مولد و منشا میں تو شاید اب ختم ہو چکی۔ لیکن شاعرین نے اس کو اس پایہ پر پہنچا دیا کہ اس کا نباہ انہیں کے رستے پر چلکر غیر ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور تھا۔ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ اردو شاعری کے دو زرین عہد ہو چکے ہیں۔ ایک جس میں میر، درد، سودا وغیرہم ہوئے اور دوسرا جس میں ذوق، مومن، ناسخ، آتش اور غالب وغیرہم یاد رہے کہ میرا روئے سخن غزل کی طرف ہے۔ داغ اور امیر نے مہتاب اور صنعخانہ کے ساتھ غزل کے دروازے پر تیغہ لگا دیا۔ انہیں کے زمانے میں خیالات کی پرواز اور کلام کا انداز مذاق عامہ کے ساتھ بدلنے شروع ہو گئے تھے۔ اور اب تو شاعری کا نظریہ ہی کچھ کا کچھ ہے۔ خدا بخشے آزاد نے نئے چمن نکالے نئی روشیں پیدا کیں گلزار سخن کو کوڑے کرکٹ سے صاف کیا۔ نئی بو دو لگائی اور نیا بیج ڈالا شعر کی فضا بدل گئی۔ اگرچہ بعضے پرانے بزرگ آج بھی اسی لے اور سُر میں غزل سرائی کر جاتے ہیں۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ گو غزل کی اصلاح غالب اور شیفتہ سے ایک پیرایہ میں ہوئی۔ عالم اردو میں اصلاح و انقلاب عظیم کا سہرا آزاد مرحوم کے سر ہے۔ تجدید عمل نے اور اصناف سخن کے علاوہ غزل کو اس اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا ہے کہ اب اچھی اور وقیع غزل کہنا دل لگی نہیں رہا۔ اب غزل میں معشوق سے گفتگو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اب غزل میں روئے سخن جذبات و واردات قلب سے اور مناظر و فطرت سے ہوتا ہے۔ وضع کے اعتبار سے صنف وہی رہی۔ قالب وہی رہا۔ مگر روح بدل گئی۔ اس ادبی تناسخ نے غزل کو بازار سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا۔ آگے کہا گیا ہے کہ اس مجموعے کے اول حصہ میں غزلیں ہیں۔ اثر صہبائی کے لطیف جذبات اور نازک احساسات زور طبع اور ندرت ادا سے بتا رہے ہیں۔ کہ غزل کی دلآویزی اور دلپذیری کے کیا معنی ہیں۔ انکی

بہت سی غزلیں مسلسل ہیں۔ طوالت کے خوف سے اوپر اوپر سے چند شعر لیکر پیش کئے جاتے ہیں۔

مرستیاں عجیب ہیں صہبائے عشق کی
پہلو میں دل ہے یا کوئی ساغر بھرا ہوا!

دل کو ساغر یا مینا سے سب تشبیہہ دیتے ہیں۔ دیکھئے کس مستانہ ادا سے دل کی ولولہ انگیزی اور ہنگامہ آرائی کا نقشہ کھینچا ہے ؎

گو کوئی کہیں نظر نہ آیا | ہر ذرے پہ ہے گماں کسی کا
گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے | دل کو ہے مگر گماں کسی کا

کس خوبصورتی سے ذاتِ باری کے حاضر و ناظر اور حاوی و ساری کُل ہونے کی صفت کا بیان کیا ہے۔

ملی ہے جاں مگر آرامِ جاں نہیں ملتا! | کہیں جہاں میں دلِ شادماں نہیں ملتا
ہجومِ اشک میں گم ہو گیا سفینۂ دل، | کراں بحرِ غمِ بیکراں نہیں ملتا
خدا کی دین ہے جسکو نصیب ہو جائے | ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

یہ شعر زبان نہیں دل ہی سے نکل سکتے ہیں۔ تیسرا شعر پہلے دو شعروں کو کہاں پہنچا دیتا ہے اسکو حزنیت نہیں بلکہ تعلیم الم کہنا درست ہے۔

دیکھو جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں
ہاتھ بھی تو نے لگایا تو بکھر جاؤں گا

حسن نظر کا پھول مگر اسکے ساتھ اشتیاق کی معصومیت اور نفس پرستی سے مبرا حسن پرستی کا آئینہ بردار یہ شعر ہے۔ نظارے اور شوق کے لئے کیا تکیا نہ اور عاشقانہ کنایہ ہے۔ اصحابِ فن پر ظاہر ہیں جو خوبیاں "بکھر جاؤں گا" اس ٹکڑے میں ہیں۔ بکھرنا کے معنی صرف پراگندہ۔ تتر بتر ہونا ہی نہیں بلکہ مچلنے اور غصہ ہونے کے بھی ہیں۔ اور اسی میں پھول کی محبوبیت کی شان مستتر ہے۔ سبحان اللہ کیا شانِ تغزل پیدا کی ہے۔

آمدِ فصلِ بہاری تو نے یہ کیا کر دیا؟
پھر کسی کی یاد میں اک حشر برپا کر دیا

وہ غزل جسکا یہ مطلع ہے مسلسل ہے۔ اس فصلِ بہاری میں بیرہن پہننے پر نہ سے نہیں ہوتا

بیابان کی خاک آسمان پر نہیں پہنچائی جاتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ غریب پرندوں کے گھونسلے کیلئے ایک تنکا بھی چمن میں باقی نہ چھوڑا جائے۔ کیونکہ ان باتوں کا تعلق قلب سے ہے نہیں زبان سے ہے۔ اس فصل بہاری میں آخر اثر صہبائی کیا کرتے ہیں ؎

چومتا پھرتا ہے کیوں اک اک کلی کو لے کے آہ
آمدِ فصلِ بہاری تو نے یہ کیا کر دیا

جن کی نگاہ مثلِ ثریا بلند ہے　　　ان کے لئے تمیزِ نشیب و فراز کیا

مرزا نوشہ نے تو ملتوں کو اجزائے ایماں بنا دیا تھا۔ یہاں ان کو ملیا میٹ ہی کر دیا گیا۔ اسی کو تصوف و ویدانت کی اصطلاح میں مبیک کہتے ہیں۔

کس قدر نظر پرور ہے ریاضِ ہستی بھی　　　اک نگار خانہ ہے نقشہائے دنیا کا!
بارہا ہوا دھوکا مجھ کو اپنی ہستی پہ　　　نقشِ غیر فانی کا، مظہرِ تجلی کا

خلقت، مخلوق اور خالق تینوں کی کیفیتِ مظاہرہ اور تعلق پر کس عجیب انداز سے روشنی ڈال گئے ہیں۔ صوفی ٹھیک کہہ گیا ہے ؎

مردانِ خدا خدا نباشند
لیکن ز خدا جدا نباشند

جنہیں خمریات یا خنامیات کہئے ان کی رباعیوں ہی میں نہیں غزلوں میں بھی جوش مارتی ہیں کہتے ہیں ؎

اللہ رے صہبائی مے نوش کی مستی
کرتا ہے ہر اک گھونٹ پہ سو شکر خدا کا!

ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن سے صہبائی کی صہبا اور مستی کا راز کھل جائیگا ؎

جاوداں ہے میری مستی جاوداں مینا مرا　　　آرزوئے صہبا مری مینائے دل مینا مرا!
نغمۂ مستی بھی ہے اور مستیٔ نغمہ بھی ہے　　　نغمہائے شوق سے معمور ہے سینہ مرا!

حرم و دیر کے مضامین تو سب کے ہاں ملیں گے۔ لیکن خمستاں میں ان کا الگ انداز ہے۔

کہنے کو ایک بات کہدینا اور بات ہے۔ لیکن استواری اور رسوخ عمل اور بات۔ کہتے ہیں ؎

کعبہ میں ہو یا ہو بتکدے میں ہر سنگ ہے آستاں کسی کا
گو کوئی کہیں نظر نہ آیا ہر ذرّے پہ ہے گماں کسی کا
گو تاروں پہ تنگی بندہی ہے دل کو ہے مگر گماں کسی کا

بہا کرلے گیا دیر و حرم کو ایک ہی رَو میں
مرے بحرِ تخیل میں وہ آزادی کا طوفاں ہے

انہیں اشعار سے ہمہ اوست کے فلسفہ پہ نظر پڑتی ہے۔ اس شعر کا حسن ادا ملاحظہ ہو ؎

چوم لیتا ہے بتوں کو بھی کہ صہبائی ہے
اس کو ہر شے میں نظر آتا ہے جلوا تیرا

خواجہ حالی مرحوم تو خوب سے خوبتر ہی کی تلاش میں رہے چنانچہ کہتے ہیں :-

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ؟

اور اس جستجو کے الجھیڑے میں انہیں یہ سا سنا رہا کہ :-

اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں

مگر مصنف خمستان کو صہبائے شوق کے اعجاز کیف نے اس ہیرا پھیری اور تگ و دَو میں نہیں ڈالا۔ وہ افضل التفضیل کے بکھیڑے میں نہیں پڑا۔ بے وقت استغراق سے لطف اندوز ہو رہا ہے مختلف مسلکوں کی گمراہی اور بے راہ روی ان کی غائر نظر سے نہ بچی۔ افسوس سے کہتے ہیں

کعبہ و دیر چھان مارا ہے کوئی اہلِ نظر نہیں ملتا

وہ کاروانِ ناز تو کوسوں نکل گیا
گم شیخ و برہمن ہیں مگر گردِ راہ میں

کس وثوق سے عقیدۂ احدیت کا اعلان ہوتا ہے ؎

حرم و دیر میں ہے گونج مرے نغمے کی
کعبہ اپنا ہے، صنم اپنا، برہمن اپنا

عرصۂ حیات عجیب طلسمات ہے۔ انسان بار بار ٹھوکر کھاتا ہے اور بار بار سنبھلتا ہے۔ کون ہے جس نے یہ ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ کس صفائی سے کہہ گئے ہیں ؎

ہر چند جانتا ہوں فریب نگاہ ہے
میں پھر بھی مبتلا ہوں فریب نگاہ میں

کیا دردانگیز اور دلگداز شعر ہیں۔ کہ پڑھنے والا تڑپ اٹھتا ہے ؎

اب کہاں وہ رقص ہائے بے خودی، ہو گیا خاموش تارِ آرزو!
اب کہاں وہ شورشِ پیہم کے لطف، اب کہاں وہ غلغلۂ آرزو!
ہو گیا ہے کس لئے غرقِ سکوت! کیا ہوا، اے بیقرارِ آرزو؟

غزل کے اوصاف میں مضمون کی برجستگی، ادا کی ندرت اور اسلوب کی چستی کو شاید بڑی جگہ دی جاتی ہے۔ یہ سب اس کے تعمیری اوصاف ہیں۔ اگر ان کیسا تھ تخیل کی بلند پروازی اور جذبات عالیہ کی قوت بھی شامل ہو جائے تو کیا کہنا۔ اثر صہبائی کی غزلیں ان امور کے اعتبار سے خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ انکا اندازِ بیان کتنا نرالا اور دلآویز ہے کہتے ہیں ؎

بوسۂ گیسو جو کبھی حسن کی غماز نہ ہو، وادیٔ عشق میں یوں لطف تگ و تاز نہ ہو
خاک ہو جاؤنگا، جل جاؤنگا، مٹ جاؤنگا، دیکھ اے پردہ نشیں! پردہ بر انداز نہ ہو
زندگی ایک فسانہ ہے سودہ بھی ایسا! جس کا انجام نہ ہو جس کا کچھ آغاز نہ ہو

شیوۂ اہلِ وفا جور پرستی ہے اثر
ٹوٹ جائے جو کبھی دل بھی تو آواز نہ ہو

اچھا ہؤا کہ اثر صہبائی قانونی کونسل میں نہیں ہیں۔ ورنہ وہ ایک بل اسی مضمون کا ضرور پیش کرتے۔ دیکھئے نا۔ کتنے پتے اور کس طمطراق سے کہتے ہیں ؎

اس مست کیلئے کوئی تعزیر کیوں نہیں
بڑھ کر شرابِ ناب سے جس کا شباب ہو

کہتے ہیں کہ عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور ہے بھی ٹھیک۔ ایک فعل کا اثر توانا اور مزاولت کیوجہ سے سیرت میں کیوں نہ جذب ہو جائے۔ مہذب زندگی میں دو چیزیں نہایت سریع الاثر ہیں۔ ایک عادت اور دوسری صحبت۔ یہ تو ہوئی حکمت اور علم نفسیات کی بات۔ اب دیکھئے کہ

شاعر اس علمی حقیقت کو کیا شاعرانہ رنگ دیتا ہے۔ کہا ہے ؎

تسکیں کو رو رہے تھے بہت اضطراب میں
اب دل کو اضطراب ہے پھر اضطراب ہو

ناصح سے ہمدردی کا رنگ بھی نرالا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ناصح کو کھا گیا ہے اثر میکشوں کا غم
قسمت! ایسے تو کوئی کسی کو عذاب ہو

جب کائنات عالم میں کوئی شے ایک رنگ اور ایک ڈھنگ پر قائم و دائم نہیں رہتی تو پھر انقلاب کو نام رکھنا یعنی چہ؟ انقلاب کو کون و فساد کا مترادف کیوں نہ کہا جائے۔ شاعر کہتا ہے ؎

ہے اسی کو فقط ثبات یہاں
ہم جسے انقلاب کہتے ہیں!

زندگی میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ایسا پیش آ جاتا ہے جو زندگی کی قدر و وقعت پر مُہر لگا دیتا ہے۔ کیا عجیب انداز بیان ہے ؎

تو نے اسے متاع گرامی بنا دیا!
یہ کہاں ہی کیا تھا زندگی مستعار میں

یہ چند شعر ایک غزل کے داد طلب ہیں ؎

لطف گناہ میں ملا اور نہ مزا ثواب میں
عمر تمام کٹ گئی کاوش احتساب میں!

تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا
میرے جنوں نے بھر دئے رنگ ترے شباب میں

آہ یہ دن کہ جاں گداز جوشش اضطراب ہے
اے وہ دَور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں

آئے دن کا سانسا بھی جانکاہ ہوا کرتا ہے۔ جزا و سزا، ثواب و عذاب کا مخمصہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ شاعر کہتا ہے اسی ہی کے جنجال میں ساری عمر بیت گئی۔ دوسرا شعر بیت الغزل ہی نہیں تغزل کی جان ہے۔ تاثر کا اعجاز اس بانکپن سے نمایاں کیا ہے کہ کافی داد نہیں دی جا سکتی یہ بھی ہوا کہ اس جنوں نے احتساب کے جن کے چہرے پر پردہ ڈال دیا اور اب وہ رات دن کا سانسا جاتا رہا۔ تیسرے شعر میں اس کیفیت کے مابعد کی عکاسی ہے۔ ان صورتوں میں یہ کیفیت عارض حال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اضطراب میں لطف جبھی آتا ہے کہ انسان جذبات کی رَو میں غرق ہو جائے

یہ اشعار بے پناہ ہیں نیز آگے چلئے جب یہ ہوتا ہے تو بقول مصنف یہ حالت ہوجاتی ہے ۔

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم

لیکن اس پر بھی عاشق صادق کے لب فریاد آشنا نہیں ہوتے بلکہ ۔

کانپ اٹھتا ہے فلک دیکھ کے یہ زندہ دلی
سکراتا ہے آگ پھونک کے خرمن اپنا

یہ یوں کہ عاشق مستقیم الشعار اور راسخ کردار ہے۔ رد عمل اسکو چھو نہیں گیا جبھی تو ۔

بارشِ سنگِ حوادث پر بھی خنداں ہی رہا
ہے حقیقت میں یہی جینا مرا جینا مرا

اور یہ کیفیت کیوں نہ ہوتی جبکہ ۔

سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
کیا خوب بے نیاز نہ تھے دو نو جہاں سے ہم

محاسن فطرت کے رنگ کو غزل کے اشعار میں کس خوبصورتی سے ڈھالا ہے ۔

وجد آفریں ہے دامنِ کہسار کی ہوا ۔۔۔ جھونکا ہر ایک گھونٹ ہے گویا شراب کا

جنگل کی چاندنی میں یہ پھول جھومتے ہیں
یا رقص ہو رہا ہے پریوں کا انجمن میں

واقعی خیال میں بڑی قوت ہے۔ اگر متخیل اس کی صحیح اور مکمل تصویر کھینچ سکے تو سمجھئے کہ شاعری کو پیغمبری کا جزو ہونے کا رتبہ اسی کی بدولت عطا ہوا ہے۔ اور جب خیال پر واردات قلب کا رنگ چڑھ گیا ہو تو کیا کہنا! یہ غزل ملاحظہ ہو جس کے چند شعر ہیں ۔

جلوہ ہے کس کے حسن کا چشم خیال میں ۔۔۔ عالم تمام ڈوب رہا ہے جمال میں !!

آرائشِ جمال میں وہ محوِ آئینہ ! ۔۔۔ ڈوبا ہوا ہوں میں کسی گہرے خیال میں

آخر اپنے صہبائی پن کو خود ہی واضح کئے دیتے ہیں جس میں تمام کو تصنع نہیں ۔

ساغرِ گل میں بادۂ شبنم ! ۔۔۔ اہلِ باطن کی میگساری ہے

پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ؎

وہی ساعتیں حاصلِ زندگی ہیں
گذر جائیں جو مستی و بے خودی میں

اس مے اور اس میگساری کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جسے فطرت کے ذرّے ذرّے میں حسن نظر آتا ہو جسے حسن نظر حاصل ہو۔ اور جس کا جذبۂ عشق لوث غرض سے پاک ہو۔ اگر میں اس شعر کی تشریح و تفسیر کرنے بیٹھوں تو یہ تبصرہ تشنہ رہ جائیگا۔ بہرحال اگلے شعر اس پہ روشنی ڈالتے ہیں ؎

تو ہی جلوہ نما ہے ہر شئے میں
یا محبت کی سحر کاری ہے!

دیکھو تو میں بھی کس کا ہوں آئینہ دارِ حسن　　　کہتا ہے ذرّہ ذرّہ ہی روک کر مجھے

اس شعر میں کتنی حیرت بھری ہے ملاحظہ ہو ؎

اے اثر ہے اسی میں کچھ لذت
یہ جو رگ رگ میں بیقراری ہے

ماشاء اللہ ناصحانہ انداز بھی کیسا سہانا ہے ؎

بیگانۂ وحدت ہے تیری ہی نظر ورنہ
کعبے میں ہے بتخانہ، بتخانہ میں کعبہ ہے

کہتے ہیں کہ فلسفۂ یگونگیت میں غلطے کھانا بیہودہ ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ ہر شے سے حسب موقع استفادہ کرے۔

چمن میں رقصِ طرب بپا ہے رباب ہاتھوں میں تھام مطرب!
عبث ہیں یہ کاوشیں تیرے دل میں پھول کیا ہیں بہار کیا ہے؟

مبالغہ نہیں اسے مطمح نظر کی علوئیت اور اختراع تمثیل کا ارتفاع کہتے۔ کہا ہے ؎

جھک جھک کے دیکھتا ہوں میں طوبیٰ کو عرش کو
کچھ اسقدر بلند ملی ہے نظر مجھے!

حقائق انسانی آنکھ سے مستور ہیں اور انسان ہے کہ ذوقِ جستجو سے مضطرب ہے چشم جستجو زمین سے آسمان اور آسمان سے زمین کیطرف بیتابانہ دیکھتی ہے۔ لیکن اس ظلمتکدہ شش جہات

میں کچھ بھائی نہیں دیتا۔ روح کی پریشانی اور گھبراہٹ کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

زندانِ کائنات میں گھبرا گیا ہوں میں
طوقِ گلو ہے حلقۂ شام و سحر مجھے

حلقۂ شام و سحر کے "طوقِ گلو" ہونے کو جتنا چاہیے دکھ لکھئے لیکن آخر پیرانی سی کئے بغیر نہیں رہتے۔ کس طنطنے سے ہنکارتے ہیں ؎

پرواز شوق کی نہ رکی گی نہ رک سکی
گو آسماں نے کر دیا بے بال و پر مجھے

یاس و تمنا کا رونا روتے ہیں اور وہ بھی ٹوٹے دل سے ؎

بر آسکے نہ یاس ہی اسکو مٹا سکے
ایسی بھی جاں گداز تمنا نہ چاہیئے!

لیکن چونکہ طبیعت قنوطیت کو نہیں چاہتی اسلئے یہ بھی کہہ اٹھتے ہیں ؎

موقوف آرزو پہ ہے ہنگامۂ حیات
مر جائیے، پہ ترکِ تمنا نہ کیجئے!

خمریات کی ذیل میں اس شعر کی ادا بھی نرالی ہے ؎

تری باتوں سے تو اے شیخ ایسا بھی نہیں لگتا
خدا غارت کرے اسکو جو پی پی کر پشیماں ہے

خود شناسی کہئے یا خود داری۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

اپنی ہستی ہے مرکزِ عالم
دیدۂ دل بھی وا کرے کوئی

ان کی میخواری صوفیانہ اور ان کی مستی صالحانہ ہے۔ اور اس کی وجہ ذوقِ نظر ہے۔ کہتے ہیں ؎

جب حسنِ کائنات ہو ایسا سرور خیز — کیوں التجائے ساغر و مینا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ حسن
لیکن نگاہِ شوق بھی پیدا کرے کوئی!

اسی غزل کا ایک شعر ہے جو خراجِ تحسین طلب کرتا ہے ؎

کچھ شغل زندگی کیلئے بھی تو چاہیئے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

اگرچہ اخگرؔ کی نظر ترکیب آفرینی اور صنعت الفاظ پہ نہیں جمتی لیکن کئی جگہ بڑی نفیس ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں۔ جیسے ؎

دل ہے کسی کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
ذرّہ ہے آفتابِ تجلّی لئے ہوئے

اسے خودداری کا احساس کہئے یا شعورِ ذات لکھتے ہیں ؎

آستانے نگاہ سے گذرے — مائلِ بندگی جبیں نہ ہوئی
لاکھ جلوے لُٹے نگاہوں میں — کوئی تصویر دلنشیں نہ ہوئی
کعبہ و دیر و میکدہ میں رہے — دل کی تسکیں مگر کہیں نہ ہوئی

ہستیٔ کوثر و بہشت اخگرؔ
کبھی شرمندۂ یقیں نہ ہوئی

دنیا جیسی کچھ ہے ظاہر ہے، مگر کیا کیا جائے۔ باہمیں مرداں بباید ساخت۔

اچھا ہے میں اسیرِ فریبِ بہار ہوں
یہ رنگ و بو فریب سہی رنگ و بو تو ہے

خمستاں کے دوسرے حصے کا نام "سمن زار" ہے۔ اس میں مختلف موضوعوں پہ نظمیں ہیں جن کی خوبی دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ نظموں کے موضوع تخیّل اور مشاہدے کا۔ نظریہ اور تجربے کا ایسا رنگین اور دلکش مرقع پیش کرتے ہیں۔ جس سے مصنف کی دقتِ نظر، وسعتِ مشاہدہ اور طرزِ ادا کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مناظرِ فطرت اور جذبات فطرت کی عکّاسی ولولہ انگیزی اور جوش و خروش کی دھوم دھام اور قوتِ تالیف کیا تو کلام کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ مسلسل نظموں سے ٹکڑے لیکر ان پر تبصرہ نہ صرف شاعر بلکہ نظم کیا تو ظلم ہے۔ اصل مکمل چیز کا مطالعہ ہی پورا لطف دیتا ہے۔ پھر بھی قارئین کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے کہیں کہیں سے مختصر انتخاب پیش کئے جاتے ہیں۔ نظم "صبح و شام" کا ایک ایک بند ملاحظہ ہو:۔

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں — ذراتِ چمن غیرتِ صد طور ہوئے ہیں
ہمشرے رخِ محبوب سے کیا دور ہوئے ہیں — اشجار مئے نور سے مخمور ہوئے ہیں
قدرت کی صراحی مئے وحدت سے بھری ہے

نیلے سے فلک پر جو درخشاں نظر آتے ہیں ستارے — کس حسن کے جلوے ہیں یہ سب سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے — اندوہ ربا روح فزا ہیں یہ نظارے
کس شاہدِ محبوب کی یہ جلوہ گری ہے

نظمیں مثل پیکرِ نغمہ، لطفِ سحر، دعا، ناکامِ محبت، برسات، حسن، تاروں بھری رات ستارۂ صبح، کائنات اور انسان، درسِ عمل وغیرہ قابلِ دید ہیں نہ کہ قابلِ انتخاب۔

نظمیں اور سنئے صنف کی نظمیں آجکل بہت شائع ہوتی ہیں۔ اس بارے میں بعض شعرا کا نظریہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مصرعوں اور بیتوں کی ترتیب ردیف و قافیہ کے لحاظ سے نئی اور انوکھی ہو۔ اچھے اچھے لفظ اور اوپری ترکیبیں گھڑ گھڑا کر پیش کر دی جائیں یعنی کچھ پیدا ہوں یا نہ ہوں لیکن الفاظ میں ترنم ہو، اور ہو وغیرہ وغیرہ۔ صہبائی کی نظمیں مترنم بھی ہیں اور توشیح میں قدامت کی اندھی تقلید بھی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ پختگی اور موضوع کی آئینہ بردار ہیں۔ ایک بند کے ساتھ اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے ؎

چھائی ہے گلستاں پہ — گھنگھور گھٹا ساقی
دریا ہے تعطر ہے! — یا موجِ صبا ساقی!
ہوں جام صبوحی کے — رندوں کو عطا ساقی

پی اور پلا ساقی
پی اور پلا ساقی

تیسرے حصے میں جس کا عنوان جامِ صہبائی ہے رباعیات اور بعض قطعات ہیں۔ اچھا کیا کہ ان کو بھی اس مجموعے میں شامل کر دیا۔ جامِ صہبائی کئی برس ہوئے کتاب کی شکل میں علیحدہ طبع ہو چکا ہے۔ اور راقم السطور اس پر مقدمہ لکھ چکا ہے۔ جس میں سے صرف ایک فقرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ "جامِ صہبائی حقیقت میں مناظرِ فطرت کی ندرت نگاریوں، حسن و عشق

کی نغمہ سرائیوں، بادۂ عرفان کی سرمستیوں، اور فلسفہ و حکمت کی حقائق آرائیوں کا روح افزوں مجموعہ ہے۔"

چوتھا حصہ اس دیوان کا راحتکدہ ہے۔ شروع کتاب میں انتساب کی عبارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے راحتکدہ کے مندرجات پر کچھ کہتے ہوئے جی کانپتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس جز میں ان کی مرحومہ رفیقۂ حیات کے نوحے اور مرثیے ہی ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ ٹکڑے ہائے دل اور پارہ ہائے جگر ہیں جو یاس و حرمان کے اشکزار میں بہہ رہے ہیں۔ اور شاعر کے دل کی کیفیت یہ ہے کہ:

سب کی سب باتیں سنیں منہہ سے نہ کچھ بولا اثر
دیر تک احباب صبر آئی کو سمجھاتے رہے

آپ کچھ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنیئے مگر جگر تھام کر اور دل پکڑ کے:

وہ حسن روح پرور روپوش ہو گیا ہے
میرا رباب دل بھی خاموش ہو گیا ہے
چپ ہو گئیں صدائیں عشق کرگئیں ہوائیں
گویا تمام عالم بے ہوش ہو گیا ہے

فصل بہار آگئی، سارے جہاں پہ چھا گئی
میرا دل حزیں مگر سوگ میں ہے پڑا ہوا
دل کہ ریاض طور تھا، بیکدۂ سرور تھا
آج وفور یاس سے خاک میں ہے ملا ہوا

آہ! کس تڑپ کے دل سے یہ لفظ نکلے ہیں:

اس کا نشاط غم نشاں، اس کی بہار میں خزاں
وائے نشاط زندگی! ہائے بہار زندگی!!

اثر کا یہ کہنا واقعی اور حسب حال ہے۔ اس مد میں آگے لکھنا فضول ہے۔

اثر میرے اشعار ہیں دل کے نالے
غزلخوانیاں مرثیہ خوانیاں ہیں!

اثر! کیا کہیں خانہ ویرانیٔ دل!!
نہیں کوئی بھی لطف اب زندگی میں!

اب مصنف کی زندگی کے اجمالی حالات کیساتھ اس تحریر کو ختم کیا جاتا ہے
خواجہ عبدالسمیع پال ۲۸ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے کشمیری فرقہ پال سے ہیں
آباؤ اجداد کشمیر سے پنجاب چلے آئے تھے۔ ان کے والد مولانا احمد دین پال صاحب علوم قدیمہ
سے بہرہ یاب اور کئی مذہبی رسائل کے مصنف ہیں۔ ان کی تربیت اور نیک شخصیت
سے اثر صہبائی کا شعار متاثر ہوا۔ ان کے بڑے بھائی امین حزیں بلند پایہ شاعر ہیں۔ انہیں
کے باعث اثر کو ابتدا میں شعر کیطرف رغبت ہوئی۔ وہ اڑھائی سال کی عمر میں والدہ کی آغوش
شفقت سے محروم ہو گئے۔ کیا اتفاق ہے کہ قریباً اسی عمر میں اثر کے فرزند ارجمند
جاوید پال کے سر سے والدہ کا سایہ اٹھ گیا۔

اثر کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ لاہور کے اسلامیہ کالج سے بی۔ اے
معہ آنرز کے پاس کیا اور ایل ایل۔ بی کے بعد سیالکوٹ میں وکالت شروع کر دی۔ لیکن طبیعت
کا لگاؤ اس شغل کیطرف نہ تھا۔ پھر لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج سے فلسفہ میں ایم۔ اے
کا امتحان پاس کیا۔ فلسفہ سے ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ ہے۔ لیکن پھر سیالکوٹ جا کر وہی
وکالت کے پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ شغل ابھی تک جاری ہے۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں ان کی خانہ آبادی
ہوئی جسکا المناک اختتام مئی ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ یہ سانحہ اتنا درد انگیز ہے کہ اسکے متعلق جو کچھ
ذکر آگے آچکا ہے کافی ہے۔ اس عبرتناک سانحہ نے جیسا کہ آگے اشارہ ہو چکا ہے صہبائی کو
اثر بنا دیا اور اثر بھی کیا۔ شکستہ دل اور سوختہ جگر کا۔ اثر کی طبع وقاد خالص شاعری کی علمبردار
ہے۔ جسے قومی شاعری کہا جاتا ہے اسکی یا ملی، سیاسی وغیرہ کی جھلک بھی ان کے کلام میں
نہیں پائی جاتی۔ وقائع نگاری بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ شاعر داخلیت کا معتقد ہے۔ ان کا
کلام کسی ایسی چیز کا حامل نہیں جسکا مسکن ان کا شعور اور ذہن نہ ہو۔ ان امور کے لحاظ سے
خمستان بانگ درا سے بہت مختلف ہے۔ اگرچہ زمانہ کے تفاوت کیساتھ اقبال اور
اثر صہبائی ایک ہی خاک سے اٹھے اور ان کا بچپن ایک ہی گلی کوچوں میں گذرا۔ متنازعہ فیہ مضامین
یا بھرتی اور آورد کے شعر خمستان میں نہیں ملیں گے۔ نہ اثر شاعری کو شاستر آرتھ یا مناظرے
سے نثر کا قائم مقام اور پروپیگنڈے کا آلہ بنانا مستحسن سمجھتے ہیں۔ انکا مذاق خالصًا ادبی اور شاعرانہ
ہے۔ ماحول جو عموماً مصنوعی ہوا کرتا ہے اور خارجیت ان کے شعور پر حاوی نہیں ہوتے۔

آجکل ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں شاعری کا مرد میدان سمجھتے ہیں وہ دو باتوں سے سخت نالاں ہیں۔ کوئی ان کا اصلی یا والد کا نام پوچھ جائے تو سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ شہرت کا قتل ہو گیا۔ اور دوسرے تلمذ یا مشورہ سخن کے ذکر کو اپنی ہتک اور تحقیر خیال کرتے ہیں مگر اثر صہبائی اس بکھیڑے سے الگ ہیں میرے مشوروں سے ان کا کہنا ہے کہ وہ مستفید ہوئے۔ لیکن میں بھی اس سے مستفید ہوا ہوں۔ اب میں یہ کہہ کر دوستوں کے کلام میں ترمیم اور تبدیلیاں نہیں کرتا کہ یہ ٹھیک نہیں، فصیح نہیں۔ نفسیات اس مضمون کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ بلکہ اب خفیف سے خفیف ترمیم بھی دلائل اور اصول فن کے استناد کیساتھ کی جاتی ہے جسطرح ایک عدالت ماتحت کا فیصلہ عدالت اپیل میں منسوخ کیا جاتا ہے۔

میں خوش ہوں کہ اثر صہبائی کا کلام اس صورت میں علم و ادب کے دربار میں جا رہا ہے اور امید ہے کہ اسکو وہی جگہ دی جائیگی جسکا وہ مستحق ہے۔ دعا ہے کہ ایسے کئی مجموعے ان کے قلم سے نکلیں اور مقبولیت حاصل کریں۔

"ہا و ہو"

جنگل ہو، یا گلشن، پھول کھلتا ہے۔ اور اپنی خوشبو سے گرد و نواح کو معطر
کرتا ہے۔ محفل عشرت ہو، یا مجلس ماتم، شمع جلتی ہے، اور اپنی ضیا سے
ماحول کو پُر نور بناتی ہے۔ شمع بزم عیش و نشاط میں جلوہ بار ہو یا گورِ غریباں پر اشکبار،
پروانہ اس کے حسن پہ بے اختیار نثار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی گاتا ہے،
کائنات کے حسن و جمال سے بیخود ہو کر گاتا ہے، حسن و محبت کے رنگین نغمے،
رندی و مستی کے کیف انگیز ترانے، اور سوز و گداز کے اندوہگین نغمے، وہ
اسرارِ حیات کو بے نقاب کرتا ہے، جذبات کی پُر تموج تصاویر کھینچتا ہے
اور اپنا سینہ چیر کر حقیقت شناس نگاہوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اسلئے نہیں
کہ اس سے شاعر کو جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت مقصود ہے۔ بلکہ محض اسلئے
کہ دستِ قدرت نے اسکو صرف گانے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ پھول نکہت
پاشی پر، شمع ضو فشانی پر، پروانہ جل جانے پر، اور شاعر نغمہ سرائی پر مجبور
ہے۔ خواہ قدر شناسی کا دور ہو، خواہ بیقدری کا، شاعر گاتا ہے، اور اپنے
فردوسی نغموں سے غمخانۂ کائنات کو مسرور کرتا رہتا ہے۔ اگر شعر گوئی کے ساتھ
اقتصادیات کو دور کا بھی واسطہ ہوتا۔ تو آج دنیا کی ادبی تاریخ نہایت ہی بے کیف
اور بے نور ہوتی۔ کہتے ہیں کہ یونانی شاعر ہومر (Homer) کا سنہ ولا

کی نسبت اشعار سے اکثر پڑ رہا کرتا تھا۔ اسپین کے مایۂ ناز ادیب سروینٹیز (Cervantes.) کی زبوں حالی بھی کچھ کم نہ تھی۔ بیچارے کو مرتے وقت بھی بستر نصیب نہ ہو سکا، اور اس نے فرشِ زمین پر سسک سسک کر دم توڑ دیا۔

ایشیا میں بھی بلند ترین شعراء فلک زدگان کی فہرست میں ہی شمار ہوئے۔ شیخ سعدیؒ کے حالات پڑھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہرکیف یہ ایک طولانی داستان ہے۔ جو ایک مستقل تصنیف چاہتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی دکھانا مقصود تھا۔ کہ اگرچہ آج بھی ہندوستان اور بالخصوص اردو کے شاعر پر عرصۂ حیات بہت تنگ ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اور اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی فلاکت شعر کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ مصائب کے دور میں اس کی شاعری اور بھی تیز اور مؤثر ہو جاتی ہے۔ آج دنیا جن سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ اس عالمگیر آشوب نے اچھی اچھی بے پروا طبیعتوں کو بھی مکدر کر رکھا ہے لیکن شاعر پھر بھی اپنے نغموں کی دھن میں مست ہے، اور چاہتا ہے، کہ زخم خوردہ دل اور پریشان دماغ اس کے نغموں سے لذت یاب ہوں۔

موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے طوفان میں "خمستان" کی اشاعت کے لئے فقط یہی ایک معذرت ہے۔

یادش بخیر فروری ۱۹۲۸ء میں میری رباعیات کا مجموعہ "جامِ صہبائی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ لیکن اشاعت کے بعد چند ہی مہینوں میں وہ تمام خیالی محلات منہدم ہو گئے۔ اور آرزوئیں اور

تمناؤں کا وہ دلکش قصرِ عظیم ایک حبابِ رنگین سے زیادہ پائدار ثابت نہ ہُوا۔ اردو کے بہترین رسائل نے بہترین الفاظ میں داد دی۔ نقادانِ فن نے تحسین و آفرین کے پھُول برسائے۔ احباب نے بیحد عقیدت کا اظہار فرمایا۔ اور کتاب کو ہاتھوں ہاتھ مفت حاصل کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ لیکن پبلک کی بےحسی کچھ ایسی حوصلہ شکن اور روح فرسا تھی۔ کہ تمام مدح و ستائش کا سلسلہ ایک مذاق سے زیادہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ بارے آہستہ آہستہ یہ بوجھ کچھ کم ہُوا۔ لیکن یہ حقیقت ہمیشہ کے لئے دل پر ثبت ہوگئی۔ کہ شاعر کا کام صرف شعر کہنا ہے۔ کتابیں بیچکر روپیہ کمانا نہیں ؛

اس مجموعہ کی اشاعت میں غالباً بہت زیادہ تاخیر ہوتی اگر ابکی دفعہ میرے عزیز محترم جناب خواجہ محمد اعظم صاحب بی۔ اے ایڈیٹر "انصاف" و مالک آزاد بکڈپو سیالکوٹ اسکی اشاعت و طباعت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہ لیتے۔ میں خواجہ صاحب موصوف کا ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ کام اپنے ہاتھوں میں لیکر مجھے ایک بہت بڑی پریشانی سے بچالیا ہے ؛

"شمستاں" میں مختلف اصنافِ سخن کی منتخب چیزیں جمع کردی گئی ہیں انتخاب میں نہائت بیدردی سے کام لیا گیا ہے۔ اور صرف وہی چیزیں شائع کی گئی ہیں۔ جو میرے معیارِ تنقید پر پوری اتری ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کلام کا بہت سا حصہ قلم انداز کر دیا گیا ہو۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں اب بھی ممکن ہے انتخاب میں بہت سے نقائص رہ گئے ہوں۔ لیکن بےعیب ذات صرف خدا کی ہے۔ کسی انسان یا اس کے کلام سے ایسی توقع بیسود ہے ؛

رباعیات کے متعلق میں اس سے پیشتر لکھ چکا ہوں کہ ان میں حضرت عمر خیام نیشاپوری کا رنگ نمایاں ہے۔ میری غزل کے ارتقا میں حضرت حافظ شیرازی رح کی شاعری کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ میری ناچیز رائے میں حافظ مغفور کی شاعری میں تغزل نے معراج کمال کو پالیا ہے۔ اور اس لحاظ سے اگر حافظ کو دنیا کا بہترین غزل گو شاعر قرار دیا جائے تو بجا ہے۔ اسکے بعد علامہ اقبال مدظلہ العالی کے روح پرور اور حیات افروز نغموں کے اثرات کا معترف ہوں۔ مرزا غالب کی ژرف نگاہی اور مولانا حسرت موہانی کی شگفتگی بھی میری غزل پر اثر انداز رہی ہے۔ اردو شاعری میں نظم کی حیثیت غزل کے مقابلہ میں چونکہ محض ثانوی رہی ہے۔ اسلئے نظم کا معیار تلاش کرنے کے لئے ہمیں انگریزی شاعری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اگرچہ انگریزی کے کسی شاعر سے بھی مجھے والہانہ عقیدت نہیں ہے۔

"راحتکدہ" کے عنوان کے ماتحت وہ تمام کلام جمع کر دیا گیا ہے جو میں نے اپنی رفیقۂ حیات "راحت" مرحومہ کے غم میں لکھا ہے۔

"راحتکدہ" کے علاوہ چونکہ میرے کلام کا بیشتر حصہ حسن کی محبت کے متعلق ہے اسلئے میں نے ان اوراق کو اسی کے محبوب نام سے منسوب کیا ہے۔

خمستان کی ترتیب میں یہ التزام بھی رکھا گیا ہے۔ کہ تقریباً ہر نظم اور ہر غزل کی تاریخ تصنیف درج کر دی گئی ہے۔ رباعیات کے سلسلے میں [illegible]

ہو سکا۔ ان کے متعلق صرف اتنی ہی تصریح کر سکتا ہوں۔ کہ وہ رباعیات جو "تمام صہبائی" کے نام سے مجموعہ کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ تقریباً ۱۹۲۶ء کے آخری نصف اور ۱۹۲۷ء کے ابتدائی نصف میں لکھی گئی ہیں۔ کلام کے ساتھ ساتھ تاریخ کا اندراج غالباً ایک انوکھی بات ہے۔ لیکن میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلئے کہ شاعر کے ارتقائی مدارج سمجھنے میں یہ بہت حد تک معاون ہو سکتی ہے ؛

میں اپنے محسن محترم علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی مدظلہٗ کا خاص طور پر ممنون ہوں، کہ انہوں نے زبان و بیان کے متعلق اپنے گرانقدر مشوروں سے مستفید فرمایا ؛

سب سے آخر مجھے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ازراہِ لطف و کرم "غمستان" کا مقدمہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ علامہ موصوف دنیائے اسلام کے مایۂ ناز ادیب اور جلیل القدر عالم ہیں۔ اور یہ میری انتہائی خوش بختی ہے کہ آپ نے اس ناچیز مجموعہ کو اپنے گراں پایہ مقدمہ سے سرفراز فرمایا۔ مجھے علامہ موصوف سے اسلئے بھی بیحد عقیدت ہے۔ کہ آپ عالم متبحر ہونے کے علاوہ اسلامی اخلاق کی پاکیزگی کے آئینہ بردار ہیں ؛

اگرچہ نیک نیم خاکپائے نیکانم

اثر صہبائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہشتیاں چہ شناسند مستیِ عرفی
نہ از شرابِ طہور، از مےِ سخن مستم

خمستاں

(نظموں، غزلوں، رباعیوں وغیرہ کا مجموعہ)

از

عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل سیالکوٹ

سنہ ۱۹۳۳ء

مطبوعہ اقبال ترقی پریس سیالکوٹ
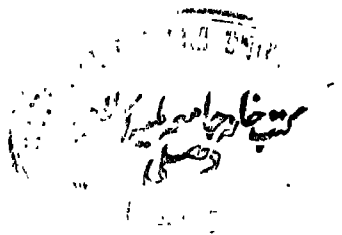
تجلیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجلّیات

کعبہ و دیر سے بیگانہ ہے شیدا تیرا
جانے کیا شخص ہے، سرشارِ تمنا تیرا!

تیرا ہر ایک کرشمہ ہے گلستاں بکنار
سیرِ فردوس نظر کو ہے تماشا تیرا

شوقِ صد کیف ہے اور دیدۂ بینا میرا
حسنِ صد رنگ ہے اور جلوۂ رعنا تیرا

کونسا دل ہے نہیں جس میں محبت تیری
کونسا سر ہے کہ جس میں نہیں سودا تیرا!

ذرّے ذرّے میں چمکتی ہے حقیقت تیری
پتّے پتّے پہ ضیا بار ہے جلوا تیرا

سنگِ اسود میں ہے مستور حقیقت تیری
اور صنم خانوں میں ہے جلوۂ پیدا تیرا

تیرا ہی ذکر ہے کعبہ ہو کہ میخانہ ہو
شیخ تیرا ہے غریقِ خمِ صہبا تیرا

چوم لیتا ہے بتوں کو بھی کہ صہبا آئی ہے
اس کو ہر شے میں نظر آتا ہے جلوا تیرا

۲۴ر دسمبر سنہ ۲۶ء

دل یاد میں کسی کی جو نغمہ سرا ہوا — ہر ذرہ کائنات کا رنگیں نوا ہوا

کیوں جگمگا رہی ہے مری محفل خیال! — تاروں پہ عکس حسن ہے کس کا پڑا ہوا!

قربان تیری شان کریمی کے ایزد! — سے دیکھیے ایک دل ہے سو وہ بھی بجھا ہوا

جس دل میں موجزن تھی کبھی تیری آرزو — آخر کو رفتہ رفتہ وہ بے مدعا ہوا

بربادیٔ آشیاں پہ ہیں کیوں لوگ خندہ زن!
سوچا ابھی کچھ کسی نے کہ آخر یہ کیسا ہوا؟!

۱۹ر دسمبر سنہ ۲۲ء

خمخانۂ نشاط ہے دائم کھلا ہوا — شام و سحر لبوں سے ہے ساغر لگا ہوا

پھر مطرب بہار نے چھیڑا رباب عشق — پھر دل میں تیری یاد سے محشر بپا ہوا

پھر چھا رہا ہے روح پہ سیلاب بیخودی — پھر سامنے ہے مے کا پیالہ دھرا ہوا

سرمستیاں عجیب ہیں صہبائے عشق کی — پہلو میں دل ہے یا کوئی ساغر بھرا ہوا!

دیر و حرم میں ڈھونڈھ رہے ہو اثرؔ کو کیوں؟
کمبخت میکدے ہی میں ہوگا پڑا ہُوا!

۱۱؍ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء

اب دل بھی ہے میہماں کسی کا! ہوتا ہے کوئی کہاں کسی کا!

کعبے میں ہو، یا ہو بتکدے میں ہر سنگ ہے آستاں کسی کا

کیوں ناز ہے حسنِ عارضی پر؟ ہوتا نہیں آسماں کسی کا!

ممکن نہیں مٹ سکے فلک سے یہ داغ ہے جاوداں کسی کا،

اس دل کی خرابیاں نہ پوچھو! ناخواندہ ہے میہماں کسی کا،

گو کوئی کہیں نظر نہ آیا، ہر ذرّے پہ تھا نشاں کسی کا،

گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے دل کو ہے مگر گماں کسی کا،

کانوں میں مرے اثرؔ ابھی تک
ہے نغمۂ جاوداں کسی کا،

۳۰؍ جون سنہ ۱۹۲۳ء

ملی ہے جان مگر آرام جاں نہیں ملتا
کہیں جہاں میں دلِ شاداں نہیں ملتا

ہجومِ اشک میں گُم ہوگیا سفینۂ دل
کرانِ بحرِ غمِ بیکراں نہیں ملتا،

خدا کی دین ہے جسکو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا،

شبِ فراق کی تاریکیاں، خدا کی پناہ!
کہیں بھی نورِ سحر کا نشاں نہیں ملتا،

حریمِ دل میں بھی آؤ تو دیکھ ڈالیں اُسے
کہ دیر و کعبہ میں اسکا نشاں نہیں ملتا

خدا کو ڈھونڈھنے والو! یہ کیا قیامت ہے
مجھے تو آپ بھی اپنا نشاں نہیں ملتا

وفورِ شوقِ عبادت سے برقِ مضطر ہوں
مری جبیں کو مگر آستاں نہیں ملتا

بنی ہے محفلِ ہستی نگار خانۂ حسن!
تلاش جسکی ہے اسکا نشاں نہیں ملتا

نہ چھیڑ بہرِ خدا! صاف صاف کہہ قاصد!
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا!

ہر ایک نشے میں مضمر خمار ہے ساقی!
سرور و کیف کہ ہو جاوداں نہیں ملتا

قفس سے چھوٹ کے آیا ہوں ساکنانِ چمن!
کہاں ہے؟ مجھکو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ مست ہوں کہ مجھے خونِ دل ہی کافی ہے
بلا سے جامِ مئے ارغواں نہیں ملتا

کہاں ہوں؟ کون سے صحرا میں جادہ پیما ہوں؟ نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

اثرؔ نوائے پریشاں ہوں بزمِ ہستی میں،
کوئی انیس، کوئی رازداں نہیں ملتا! ۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء

ظلمتِ دشتِ عدم میں بھی اگر جاؤں گا لیکے ہمراہ مہِ داغِ جگر جاؤں گا!

عارضِ گل ہوں نہ میں دیدۂ بلبل گلچیں! ایک جھونکا ہوں نفس سے گزر جاؤنگا

مجھکو جلنا ہی ہے اے چرخ اگر مثلِ سپند بزمِ ہستی میں صدا ایک تو کر جاؤں گا،

اے فنا ٹوٹ سکیگی نہ کبھی کشتیٔ عمر! میں کسی اور سمندر میں اُتر جاؤں گا،

دیکھ جی بھر کے مگر توڑ نہ مجھ کو گلچیں! ہاتھ بھی تونے لگایا، تو بکھر جاؤں گا،

ایک قطرہ ہوں مگر سیلِ محبت سے ترے ہو سکے جو نہ سمندر سے بھی، کر جاؤنگا

دورِ گلشن سے کسی دشت میں لیجا صیاد! ہمصفیروں کے ترانوں میں تو مر جاؤنگا

صحنِ گلشن میں کئی دام بچھے ہیں اے اثرؔ!
اُڑ کے جاؤں بھی اگر میں تو کدھر جاؤں گا! ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۳ء

آمدِ فصلِ بہاری! تو نے یہ کیا کر دیا ؟ پھر کسی کی یاد نے اک حشر برپا کر دیا
پھر نگاہِ شوق جویائے مئے صہبا ہوگئی دل کو پھر ذوقِ تمنا سے شناسا کر دیا
پھر مری رگ رگ میں دوڑا یا ہے خونِ زندگی پائے وحشی کو مرے پھر دشت پیما کر دیا
پھر فضائے روح کا ہر ذرہ رقصاں ہوگیا بربطِ دل کو مرے پھر نغمہ پیرا کر دیا ،
ہوگئی بادِ صبا پھر گیسوئے عنبر فشاں پھر کسی کا حسن ہر گل میں ہویدا کر دیا ،

چومتا پھرتا ہے کیوں اک اک کلی کو اے اثر!

آمدِ فصلِ بہاری نے تجھے کیا کر دیا ؟ ؟ ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء

بلائیں حسن کی لینے کو آفتاب آیا عجیب دھوم سے اس شوخ پر شباب آیا!
نگاہِ شوق کی تھیں بدحواسیاں، ورنہ ہزار بار وہ محفل میں بے نقاب آیا
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی بزمِ جہاں ترا خیال بھی دل میں برنگِ خواب آیا
عجیب لطف سے معمور تھی وہ خاموشی ، مری زباں رکی ، اور انہیں حجاب آیا
ترے وصال میں دریائے بیخودی تھا رواں ترے فراق میں طوفانِ اضطراب آیا

بہت بلند ہے موت و حیات سے وہ آشر

۱۰ اپریل ۱۹۲۵ء

جو بارگاہِ محبت سے کامیاب آیا

ہے بادۂ نسیمِ سحر دلگداز کیا! — پینے سے اب کسی کو بھلا احتراز کیا!

گو تجھ میں گم ہوں، پھر بھی ہے احساسِ زندگی — امواجِ بحر میں نظرِ امتیاز کیا!

نغموں کو سُن کے روح مری کیوں اُڑ سکے — ڈوبا ہوا ہے سوز میں مطرب کا ساز کیا!

دل میکدہ بنا ہے وفورِ نشاط سے — لبریزِ کیف تھی نگہِ دلنواز کیا!

جب سوزِ عشق پر ہی رہا انحصارِ زیست — مل جائے بھی اگر تو کرے چارہ ساز کیا؟

جن کی نظر مثالِ ثریا بلند ہے — ان کیلئے تمیزِ نشیب و فراز کیا!

ٹھکرا رہے ہیں انجم و خورشید و ماہ کو — تیرے نیاز مند ہوئے بے نیاز کیا!

ہم کو فقط ہے ذوقِ نظر سے غرض آشر!

کیا جانیں کیا ہے حسنِ ازل؟ اور مجاز کیا؟

۶ اگست ۱۹۲۵ء

ہر برگِ زرفشاں چمنِ زرنگار کا
گویا ورق ہے ایک کتابِ بہار کا

نغموں سے گونج اٹھی ہے فضا کوہسار کی
رنگیں نوا ہوا ہے ربابِ آبشار کا

عالم تمام میکدۂ حسن بن گیا
رخ بے نقاب دیکھ کے صبحِ بہار کا

تارِ نگاہ جادۂ صد رنگ میں ہے گم
گویا کہ ایک رشتہ ہے پھولوں کے ہار کا

رنگینیاں ہیں خوابِ محبت کے سامنے
یا لالہ زار ہے شفقِ پُر بہار کا!

آغوش میں ہے پیکرِ رنگِ بہارِ حسن
کھٹکا نہیں ہے گردشِ لیل و نہار کا

وہ رشکِ ماہتاب ہے چشمِ خیال میں
اب رنگِ بیکسی نہیں شبہائے تار کا

آئینۂ جمال ہے فردوسِ کائنات
یا بحرِ بیکراں ہے مئے خوشگوار کا!

رکتا ہے گام گام پہ پائے نگاہِ شوق
لغزش میں جس طرح ہو قدم میگسار کا،

آنکھوں پہ چھا رہا ہے وہی حسنِ جانفزا
بدلا ہوا ہے رنگ دلِ داغدار کا

بوئے نسیم دیتی ہے دلکو پیامِ دوست
ہر سانس مشکبار ہوا انتظار کا

پھر بہ تقاضائے حسنِ شعر بہار ہیں اثر !

۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء

حافظ ہے اب خدا ہی دلِ بے قرار کا

آہ! ذوقِ نظر نہیں ملتا　　ڈھونڈھتا ہوں مگر نہیں ملتا!

ہو سکوں جس سے دل کو، وہ جھونکا،　　اے نسیمِ سحر نہیں ملتا!

ظلمتِ شب ہے وحشتِ غربت میں　　گم ہوں، اور راہبر نہیں ملتا

کعبہ و دیر چھان مارا ہے　　کوئی اہلِ نظر نہیں ملتا

حضرتِ دل! کچھ آپ ہی کہیے　　کوئی پیغامبر نہیں ملتا،

زندگی کو میں کیا کروں اے خضر!　　راز اس کا اگر نہیں ملتا،

عشق ہے، ذوقِ جستجو ہے اثر!

۷ اگست ۱۹۲۴ء

نہ ملے، وہ، اگر نہیں ملتا

رنگ ہو حقیقت کا، یا بتانِ دنیا کا　　میں تو اک پجاری ہوں جلوہ ہائے رعنا کا

آندھیاں جوانی کی خوب رنگ لائی ہیں　　کیا بھڑک اٹھا شعلہ آتشِ تمنا کا!

اب پلائے جا ساقی! چشمِ بادہ آگیں سے
ہوش ہے کسے باقی، ساغر اور مینا کا!

جستجوئے منزل میں بیقرار د آوارہ،
میں بھی ایک منظر ہوں موجہائے دریا کا

رہروِ محبت کی ہر قدم پہ منزل تھی،
حسن کا تھا آئینہ، ذرّہ ذرّہ صحرا کا

کس قدر نظر پرور ہے ریاضِ ہستی بھی!
اک نگار خانہ ہے نقشہائے زیبا کا!

بارہا ہوا دھوکا مجھ کو اپنی ہستی پر
نقشِ غیر فانی کا، مظہرِ تجلیٰ کا،

اے اشرؔ جوانی میں ضبط کھو گیا ایسا،
اک غلام ہوں گویا قلبِ ناشکیبا کا

۱۲ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

میخانۂ گلزار میں ہے دورِ صبا کا
مستی سے ہے لبریز ہر اک جھونکا ہوا کا

ہر برگ پہ ہے نقش قلمکاریٔ فطرت
ہر گل میں تبسم ہے کسی ہوش رُبا کا

چھایا ہوا ہر شے پہ ہے اک جلوۂ معصوم
پرتو ہے ہر اک قلب پہ انوارِ خدا کا

ذرّوں میں ہے رنگینی و تابانیٔ خورشید
اک سحر ہے یہ حسن بہاراں کی ضیا کا

یہ رنگ [illegible] اور یہ مینوش گھٹائیں!
کیا وقت یہ توبہ کا ہے؟ ہے نام خدا کا!

یہ وقت کچھ ایسا ہے کہ ہر ذرۂ ہستی میکش ہے ترے میکدۂ جود و عطا کا

اک جام پلا نوش کو! اندھیر ہے اندھیر! جاتا رہا میخانے سے بھی خوف خدا کا؟

اللہ رے "صہبائی" مے نوش کی مستی!

کرتا ہے ہر اک گھونٹ پہ سو شکر خدا کا ۱۲ر جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

احسان کیوں اٹھاؤں کسی چارہ ساز کا؟ ممنون ہوں ازل سے دلِ بے نیاز کا

چھایا ہوا ہے صبح کی معصومیت کا رنگ غرقِ دعا ہو، وقت ہے راز و نیاز کا

سب شوخیاں بجا ہیں، مگر اے نگاہِ ناز! دیکھ! آئنہ نہ توڑ دلِ پاکباز کا

شاداب ہے نگاہ، معطر فضائے دل تم ہو کہ کوئی گلکدہ انداز و ناز کا!!

ہر چند نغمہ ریز رہا سازِ ہست و بود لیکن کھلا نہ راز نوا ہائے ساز کا،

عرشِ بریں وہ مسندِ دارائے کائنات گویا نشاں ہے میری جبینِ نیاز کا

غمہائے روزگار کا ممنون ہوں اثر!

پتھر سا دل خزینہ بنا ہے گداز کا،

نہ ہو اپنے ہی پہلو کا کہیں جب ہمزباں اپنا ،
تو پھر اے بختِ واژوں کس طرح ہو آسماں اپنا ! !
چھپی جاتی ہیں کیوں سب بجلیاں بادل کے دامن میں
اڑا جاتا ہے سوئے آسماں جب آشیاں اپنا
ہوائے شوق لے اڑتی ہے سوئے کہکشاں اسکو،
مگر پھر بیٹھ جاتا ہے غبارِ ناتواں اپنا
نہ سر اپنا کسی کے سامنے خم ہو کبھی یارب !
بکھر جائے مگر شیرازۂ روحِ رواں اپنا
بگولے کی طرح آشفتگی سے دشت پیما ہوں ،
خدا جانے کہیں ملتا بھی ہے اب کارواں اپنا !
کہاں تک شکوۂ بیداد و جورِ آسماں کیجے !
اثرؔ ! ہو بے نیازِ برق و باراں آشیاں اپنا

اپریل ۱۹۲۵ء

وہ چشمِ دل کا ہنگامِ سحر بیدار ہو جانا
وہ میری روح پر اک بارشِ اسرار ہو جانا!

وہ انکی خشمگیں نظروں کا دل کے پار ہو جانا
وہ اپنی زندگانی سے مرا بیزار ہو جانا

دلِ تاریک کی گہرائیاں ظلمت ہی ظلمت ہیں
کبھی اے برق اس پر بھی تجلی بار ہو جانا!

وہ انکا میری جانب دیکھ کر کچھ مسکرا دینا
وہ صہبائے محبت سے مرا سرشار ہو جانا!

نظر آتا ہے اُن آنکھوں کو کیا انجام مستی کا!
جنہیں آتا ہے بزمِ عیش میں خونبار ہو جانا

شرابِ حسن سے شام و سحر مخمور ہی رہنا
جو ہونا بھی تو صہبائی سا اک میخوار ہو جانا

میں بھی سرود خانۂ ہستی میں ساز تھا
جس کا ہر ایک نغمہ بہت دلگداز تھا

پندار نے وجود و عدم کو سمجھ لیا
دیکھا، تو یہ بھی راز تھا اور وہ بھی راز تھا

معمورِ حسن روزِ ازل سے ہے کائنات
کیونکر کہیں کہ عارضی رنگِ مجاز تھا!

سرمستیاں عجیب تھیں عہدِ شباب کی
عالم تمام میکدۂ حسن و ناز تھا

ہر حال میں دماغ مرا عرش پر رہا ،
لوحِ ازل پہ نام مرا سرفراز تھا

اے حسن! کیا اسی سے تغافل شعاریاں! ہر سانس جس کا تیرِ فسانہ طراز تھا
جبتک جنونِ عشق سے ناآشنا رہا! میں مبتلائے فکرِ نشیب و فراز تھا
جبتک نہ رازِ عالمِ مستی سمجھ سکا میں بھی اسیرِ سلسلۂ حرص و آز تھا
اہلِ کرم کو اس سے شکائت رہی مدام
صہبائی ایک مست تھا اور بے نیاز تھا ۲۹ر نومبر ۱۹۲۶ء

حسن اور حسن بھی ہے فروغِ شباب کا گویا چھلک رہا ہے پیالہ شراب کا
اب کون ہو حریف رُخِ بے نقاب کا! ہے اک چراغِ کشتہ، چراغ آفتاب کا
احساس ہو رہا ہے گناہ و ثواب کا شائد اُتر رہا ہے وہ نشہ شباب کا
بن دیکھے حال یہ ہے مرے اضطراب کا کیا جانے کیا ہو! پردہ جو اُٹھے نقاب کا
زیرِ نقاب ہے بھی کوئی حسن دلفریب؟ یا یونہی اک فریب ہے رنگِ نقاب کا؟
وجد آفریں ہے دامنِ کہسار کی ہوا جھونکا ہر ایک گھونٹ ہے گویا شراب کا
برسات میں عجیب ہی پرکیف ہے سماں جام و نگار و چنگ و شبِ ماہتاب کا

جادۂ رہو حرم میں پھر اے ننگِ یکتاں[1] | ہے خوف میکدے میں اگر احتساب کا
اک موجِ آتشیں تھی، کہ برباد کر گئی، | نظارہ کیا ہُوا ہے رُخِ بے نقاب کا!
ڈل[1] میں ہے کوئی پھول کنول کا کھلا ہُوا | جلوہ ہے سطحِ چرخ پہ یا ماہتاب کا

دورِ طرب ہے تو بھی اٹھ جھوم جھام لے
"آتا نہیں پلٹ کے زمانہ شباب کا" ۲۳ اگست ۱۹۲۶ء

جاوداں ہے میری مستی، جاوداں پینا مرا،
آرزو صہبا مری، مینائے دل مینا مرا،
بارشِ سنگِ حوادث پر بھی خنداں ہی رہا
ہے حقیقت میں یہی جینا، یہی جینا مرا
نغمۂ مستی بھی ہے، اور مستیٔ نغمہ بھی ہے
نغمہائے شوق سے معمور ہے سینہ مرا
جلوۂ پیدا و پنہاں ہے اسی میں عکس ریز

[1] کشمیر کی ایک نہایت ہی حسین جھیل ہے۔

رشکِ صد آئینہ خانہ ہے یہ آئینہ مرا!

زینتِ بزمِ دو عالم جلوہ آرائی تری!

غرقِ صہبائے تماشا دیدۂ بینا مرا!!

کیا ہوا بے بال و پر ہوں، بے نوا ہوں اے اثرؔ!

عرش ہے منزل مری، اور کہکشاں زینہ مرا!! ۲۶ر دسمبر سنہ ۲۶ء

ہیں سبھی دوست نہیں کوئی بھی دشمن اپنا — ساغرِ دل مئے الفت سے ہے روشن اپنا

دامِ صیاد میں اب آکے کھلی ہیں آنکھیں — میں تو گلشن کو سمجھتا رہا گلشن اپنا

حرم و دیر میں ہے گونج مرے نعرے کی — کعبہ اپنا ہے، صنم اپنا، برہمن اپنا

منتظر توبہ کی دائم رہی رحمت تیری! — غرقِ دریائے معاصی رہا دامن اپنا!

میکشو! سجدۂ شکرانہ ہو ہر جام کے بعد — داورِ حشر بھی آخر نہیں دشمن اپنا

کانپ اٹھا ہے فلک دیکھ کے یہ زندہ دلی

مسکراتا ہے اثرؔ پھونک کے خرمن اپنا، ۱۸ر فروری سنہ ۲۷ء

دل مبتلائے دیر و کلیسا نہ ہو سکا ؛ شیدا ترا کسی پہ بھی شیدا نہ ہو سکا

اے وائے موجِ خوں! کہ نہ آنکھوں سے بہہ سکی اے وائے دل!! کہ وقفِ تمنا نہ ہو سکا

کیا کیا تھے آرزوئے تجلّی کے اضطراب! دیکھا تو دل حریفِ تجلّی نہ ہو سکا

ہر چند وقفِ دید رہا ہوں تمام عمر لیکن بقدرِ شوق تماشا نہ ہو سکا

ہر ایک کو فلک سے امیدِ وفا رہی یہ بیوفا کبھی بھی کسی کا نہ ہو سکا

ہم جان و دل کو نذرِ تغافل بھی کر چکے وہ مسکرا کے دیکھتے، اتنا نہ ہو سکا،

جسکی نظر میں کیف دو کم مست و بود ہے کیا اس پہ میرا حال ہی افشا نہ ہو سکا؟

انکارِ حسن کے اور بھی بے باک ہو گیا سرشارِ شوق پیروِ موسےٰ نہ ہو سکا،

رنگینیٔ نقاب کو عارض سمجھ لیا جب بے نقاب عارضِ زیبا نہ ہو سکا

وہ ذوقِ دید کیا جو نہ سرشار کر سکے!! وہ حسن کیا جو قدمِ صہبا نہ ہو سکا!!

اک رندِ کم سواد ہے مستِ ازل نہیں جو بے نیازِ ساغر و مینا نہ ہو سکا

تازیست اے اشک رہیں بیتابیاں مری
یہ قلبِ بیقرار شکیبا نہ ہو سکا،
۲۱ مئی سنہ ۱۹۲۷ء

دیر و حرم سے بے نیاز ہے ترا آشنا ہُوا،
اس کو کسی سے کیا غرض! جس کا تو مدّعا ہُوا،

شوکتِ دو جہاں مرے پاؤں میں ہے پڑی ہوئی
کونسی بارگاہ میں! سر ہے مرا جھکا ہُوا ؟

اس کی نظر میں ہیچ ہیں قیصر و جم کی عظمتیں
وہ تو ہے سب کا آسرا جس کا تو آسرا ہُوا

سرحدِ عقل سے پرے، رفعتِ عرش سے بلند
جانے کہاں نکل گیا میں تجھے ڈھونڈھتا ہُوا!

گلکدۂ بہار، یا میکدۂ جمال ہے !
آپ سے کھو گیا ہوں میں حسن کو دیکھتا ہُوا

تم تو نگاہ پھیر کر ناز سے مُسکرا دیے،
شیشۂ آرزو مگر ٹوٹ کے کیا سے کیا ہُوا!!

کشتیٔ زندگی مری چھُپ تو گئی نگاہ سے
یہ نہ کبھی کھُلا مگر، حشر پھر اس کا کیا ہُوا!

رنگِ مجاز بھی ہے کیا روح فزا، نظر فروز!
حسنِ ازل یہ ہے مگر پردہ سا اک پڑا ہُوا

بزمِ جہاں کا حسن ہے موجِ طلسمِ رنگ و بُو
دیدۂ شوقِ پاکباز تارکِ ماسوا ہُوا،

آج فروغِ حسن سے غیرتِ طُور بن گیا
تیرے فراق میں جو تھا شعلۂ دل بجھا ہُوا

یہ بھی عجیب راز ہے میری حیات کا اثرؔ!
مائلِ کشمکش ہوں میں جبر کو جانتا ہُوا،

یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء

اُن سے آغازِ رسم و راہ ہُوا — آخرِ کار دل تباہ ہُوا

دلِ سوزاں کہ تھا شرار آباد — مشتِ خاکسترِ سیاہ ہُوا

منتقل ہے شبِ غمِ ہستی — جلوۂ ماہ گاہ گاہ ہُوا،

تجھ کو دیکھا تو کیا قصور کیا؟ — تجھ کو چاہا تو کیا گناہ ہُوا؟

دلِ مظلوم کی وفا کوشی! — پھر بھی تجھ سے ہی دادخواہ ہُوا!!

نہ چھُٹا شغلِ عاشقی نہ چھُٹا — ہم کو ہر چند انتباہ ہُوا

اشکؔ ایسے نہ بچ سکے شاید!
حملۂ غم ہے بے پناہ ہُوا، ۱۹ فروری سنہ ۱۹۳۱ء

پنہائے کائنات میں تیرے سوا ہے کیا! — تو مدّعا ہے! اور مرا مدّعا ہے کیا!

پھر قلبِ بیقرار ہے، سرشارِ آرزو — پھر اعتبارِ وعدۂ فردا ہوا ہے کیا!

میخانۂ نشاط ہے! یا برقِ جانگداز — معلوم کیا ہو! وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا!

جس حُسن کی نقاب ہے رنگینیٔ مجاز — اب کیا کہیں وہ جلوۂ رنگیں ادا ہے کیا!

نا آشنا سی وہ نگہِ آشنا ہے کیوں ؟ | اپنے بھی حال شوق مرا کھل گیا ہے کیا!

اے مطرب بہار! محبت کا راگ چھیڑ | یہ فکرِ ابتداؤ غمِ انتہا ہے کیا !

برہم ہوئے حضور، مرے عرضِ شوق پر | آخر یہی خطا ہے ؟ مگر یہ خطا ہے کیا!

نکلیگا اس سراب سے کب کاروانِ زیست! | یارب! طلسمِ بندگیٔ صبح و مسا ہے کیا!

دارا و جم گدا ہیں اسی بارگاہ کے | دارا و جم کے در پہ تری التجا ہے کیا!

طوفانِ رنگ و بو میں مری روح کھو گئی، | رنگینیٔ بہار میں تو ہی چھپا ہے کیا !

اسپرِ نثار کون و مکاں کا سکونِ عیش | اللہ! لذتِ دلِ شورش ادا ہے کیا !

دو دن کی زندگی بھی ہوئی نذرِ رنج و غم | تو رازِ ہست و بود کو سمجھا ہوا ہے کیا ؟

اپنی وفا پہ ناز ہے کیوں اسقدر اثرؔ!
سوچا بھی ہے کبھی کہ ترا ادعا ہے کیا ؟ ۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء

اب ٹوٹ جائیگا دلِ امیدوار کیا ! | برہم رہیگی وہ نگہِ سحر کار کیا ؟

جب اُنکو دیکھنا، تو نظر بھر کے دیکھنا | یارب ہے جذبِ جلوۂ زیبائے یار کیا!

کیا خوب! دو جہاں پہ مجھے اختیار ہے! میں سوچتا ہوں دل پہ بھی ہے اختیار کیا!

بدلا ہوا ہے محفلِ ہستی کا رنگ کیوں؟ دنیا ترے فراق میں ہے سوگوار کیا؟

اس تیرگی میں تو کچھ سوجھتا نہیں، یونہی رہینگی ہجر کی شبہائے تار کیا؟

تُو اور نظامِ دہر اُلٹنے کی کاوشیں! اے خود فریب! تجھ کو غمِ روزگار کیا؟

ڈوبی ہوئی ہے کیفِ محبت میں کائنات لائی ہے یہ پیام نسیمِ بہار کیا؟

سازِ طرب، کنارۂ جُو، چودھویں کا چاند اے ساقیٔ بہار! ہے اب انتظار کیا!

مستی میں جھومتا ہے دلِ بیخودی پرست میخانۂ نشاط ہے ابرِ بہار کیا؟

ہر چیز مشکبار ہے، سرشارِ حسن ہے چھایا ہُوا ہے جلوۂ صبحِ بہار کیا!

صہبائے آرزو میں ہے اک سرمدی سرور سرشارِ آرزو کو خزاں کیا! بہار کیا!

اک کیفِ سرمدی ہے مرا کیفِ زندگی مجھ کو خبر نہیں ہے خزاں کیا! بہار کیا!

خمخانۂ الست کا اک رند ہے اشکؔ،
سمجھے ہوئے ہیں آپ اُسے بادہ خوار کیا! ۱۵ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

موت آئی ہے مری برقِ تمنا ہو کر — پھونک ڈالا ہے مجھے انجمن آرا ہو کر!

رحم آتا ہے بہت خضر و مسیحا پہ مجھے — قیدِ ہستی میں پھنسے خضر و مسیحا ہو کر

سوزِ غم کم نہ ہوا منتِ پروانہ بھی کی — کیا ملا شمع کو یوں بزم میں رسوا ہو کر!

رازِ غم ایک خزینہ ہے جو سینے میں رہے — خاک ہو جاتا ہے لیکن یہی افشا ہو کر

ہجر کی آگ بجھائے نہیں بجھتی توبہ! — اشک اُمڈے ہی چلے آتے ہیں دریا ہو کر

بزمِ احباب میں اک خندۂ شیریں ہے اثرؔ
خوب جی کھول کے رو لیتا ہے تنہا ہو کر

۲۰ / اگست سنہ ۱۹۲۶ء

دیدنی ہے ترے شباب کا رنگ! — ہو گیا زرد آفتاب کا رنگ

رختِ ہستی کو پھونک ڈالے گا — شعلۂ حسنِ بے نقاب کا رنگ

دل کی دنیا تباہ کر ڈالی، — اُف رے ظالم! ترے عتاب کا رنگ

غرقِ رنگِ شباب تھی ہر شے! — آہ! وہ مستیٔ شباب کا رنگ!!

کھل گیا رازِ بیخودی میرا — اس کی آنکھوں میں ہے حجاب کا رنگ

کیف انگیز جلوۂ ساقی ! روح افروز ماہتاب کا رنگ !!

اے اشتیاقِ لطف انتظار میں پھر ،
آچلا ہے کچھ اضطراب کا رنگ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم !

برسوں ہوا نہ فیصلہ فتح و شکست کا
برسوں ستیزہ کار رہے آسماں سے ہم

اے وائے فکرِ راحت و صد وائے خوفِ دام !
دیکھا کئے بہارِ چمن آشیاں سے ہم

فرطِ غضب سے شیخ جہنّم نشاں ہوا
پہنچے مگر بہشت میں کوئے بتاں سے ہم

اب کچھ تو فیصلہ ہو حیات و ممات کا

تنگ آ گئے ہیں روز کے اس امتحاں سے ہم

سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی،

کیا خوب بے نیاز تھے دونو جہاں سے ہم!

کچھ پھول چننے آئے تھے اے باغباں! مگر

کچھ داغ لیچلے ہیں ترے گلستاں سے ہم

سجدے کے داغ سے نہ ہوئی آشنا جبیں

بیگانہ وار گذرے ہر اک آستاں سے ہم

ہے ایک آرزوئے تماشائے رنگ و بو

لیجائینگے نہ کچھ بھی ترے گلستاں سے ہم

وہ جانِ زندگی تو رہا ہم سے سرگراں

اور اپنی زندگی سے رہے سرگراں سے ہم

۶ر نومبر ۱۹۲۵ء

چوم، گلہائے نو بہار کو چوم! جھوم، اس مستیٔ بہار میں جھوم!
چھا گیا ہے ہر ایک ذرّے پر صبحِ خنداں کا جلوۂ معصوم
وجد آباد ہے فضائے جہاں تو ہی ناداں ہے اے دلِ مغموم!
وہم ہے وہم کائنات تمام میں بھی ہوں ایک نقطۂ موہوم
تو ہی ساری ہے جب ہر اک شے میں! جانے موجود کیا ہے! کیا معدوم!!
سازِ مستی کا چھیڑنا اچھا رازِ ہستی کسے ہوا معلوم؟

بس پریشاں پھرے محبت میں
اے اثرؔ ہے یہی ترا مقسوم!
۲۵ راکتوبر ۱۹۲۶ء

یہ خواب ہے کہ حقیقت نہ ہو سکا معلوم رہی یہ بات کہ "کچھ ہے" سو وہ بھی کیا معلوم!
شبِ سیاہ ہے طوفانِ باد و باراں ہے نہ راہبر ہے، نہ ہمدم، نہ راستا معلوم
وہ مسکرا دئے سن کر فسانۂ غمِ ہجر، جو میری جان پہ گذری، کسی کو کیا معلوم!
یہ داستانِ وفا چھیڑنے سے کیا حاصل! نہ ڈال مجھ پہ یہ افسوں، تری وفا معلوم!

پہاڑ عمر کا پایانِ کار کٹ تو گیا — مگر ہُوا نہ ہمیں اس کا مدعا معلوم
اثرؔ فسانۂ ہستی بھی کیا فسانہ ہے!
کچھ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ۱۵ر فروری ۱۹۳۱ء

جلوہ ہے کس کے حسن کا چشمِ خیال میں — عالم تمام ڈوب رہا ہے جمال میں!!
آرائشِ جمال میں وہ محوِ آئنہ — ڈوبا ہُوا ہوں میں کسی گہرے خیال میں
حاصل نہ کچھ ہُوا دلِ خانہ خراب کو — اک عمر تلخ ہوگئی فکرِ مآل میں
پرواز کر رہی ہے مری روح سوئے عرش — گم ہو رہا ہوں تیرے ہجومِ خیال میں
اس خاکسار دل کو نہ یوں رائگاں سمجھ! — موجِ مئے طہور ہے جامِ سفال میں
کس کی ضیائے حُسن ستاروں میں ہے اثرؔ!
ڈوبا ہُوا ہے کیوں کسی گہرے خیال میں! ۸ر اپریل ۱۹۲۳ء

تو ہو تو لطف یکساں ہے دشت میں، چمن میں
خلوت میں انجمن ہے، خلوت ہے انجمن میں

دل میں جو عکسِ گُل ہے، تصویر ہے کسی کی
کوئی بسا ہُوا ہے پھولوں کے پیرہن میں

اب بیکلی نہیں ہے، وہ بیدلی نہیں ہے
موجِ مئے سکوں ہے، مہتاب کی کرن میں

جنگل کی چاندنی میں یہ پھول جھومتے ہیں!
یا رقص ہو رہا ہے پریوں کی انجمن میں!

نغمے جدا جدا ہیں تسکینِ دل کی خاطر
صحرا میں خامشی ہے، شورش ہے انجمن میں

ناصح کی بھی زباں اب رُک رُک کے چل رہی ہے
کیا کیا کرامتیں ہیں اس چشمِ سحرفن میں!

کیونکر آثرؔ بیاں ہو بے مہریٔ عزیزاں!
غربت میں اب وطن ہے، غربت ہے اب وطن میں!

۲۴ اگست ۱۹۲۲ء

ڈوب گیا ہے سازِ دل، نغمۂ دلگداز میں
موجِ مئے سرود تھی خندۂ جاں نواز میں

چشمِ حقیقت آشنا کھول کے دیکھ بیخبر!
حسنِ ازل ہے جلوہ ریز آئنۂ مجاز میں

عالمِ خواب میں تمام عمرِ مری گذر گئی
کوئی فسونِ خواب تھا نرگسِ نیم باز میں!

چاہے جسے عطا کرے اسکی ہیں سرفرازیاں
ہیں کئی آسماں مری گردِ رہِ نیاز میں

پیکرِ خاک سے عیاں ہونے لگیں تجلیاں
برقِ ضیائے طور تھی، تیری نگاہِ ناز میں

جوشِ نمود دیکھئے، شوقِ شہود دیکھئے!
ذوقِ تماشا بن گیا چشمِ نظارہ باز میں

رسمِ جہانِ عشق کا اور ہی رنگ ہے اثرؔ!
سجدہ کناں ہے غزنوی بارگہِ ایاز میں!!! ۸؍مئی ۱۹۲۳ء

عشق و جنوں پرست ہوں، بادہ کشِ الست ہوں
میکدۂ ازل کا ایک رندِ سیاہ مست ہوں

سجدے کے واسطے مرے، گردنِ آسماں ہے خم
تیری رہِ نیاز میں ایک گدائے پست ہوں

زاہدِ کم نظر نہ کچھ اس کے سوا سمجھ سکا
کافرِ بت پرست ہوں، جام و سبو بدست ہوں

تجھ کو خیالِ حور ہے، مجھ کو خیالِ طور ہے
ہاں! تو خدا پرست ہے، ہاں! میں صنم پرست ہوں

چشمِ نجوم میں اثرؔ کوئی نہیں ہے امتیاز
میں ہی اسیرِ حلقۂ دامِ بلند و پست ہوں ۲۸؍جون ۱۹۲۳ء

زندگی کو حباب کہتے ہیں
آرزو کو سراب کہتے ہیں

تو سمجھتا ہے جس کو بیداری
اہلِ ہوش اس کو خواب کہتے ہیں

ہے اسی کو فقط ثبات یہاں
ہم جسے انقلاب کہتے ہیں

سینۂ چرخ میں ہے داغِ فراق
لوگ کیوں آفتاب کہتے ہیں!

رقصِ برقِ جمال ہے دل میں!
کم نظر اضطراب کہتے ہیں

کاش آغوشِ شوق ہو تیرا!
جس کو حسن المآب کہتے ہیں

مستِ خمخانۂ ازل ہے **اثر**
لوگ رندِ خراب کہتے ہیں

۱۴؍اگست ۱۹۲۳ء

شامِ فرقت کو بھول جاتا ہوں،
صبحِ عشرت کو بھول جاتا ہوں

بادۂ ذکر میں فنا ہو کر،
رنج و راحت کو بھول جاتا ہوں

کیا سکوں پاس ہیں تری آنکھیں!
اپنی وحشت کو بھول جاتا ہوں

یاد تیری ہے کس قدر شیریں!
رنجِ فرقت کو بھول جاتا ہوں

عارضی ہے طلسمِ رنگِ بہار   اس حقیقت کو بھول جاتا ہوں
کثرت آرائیوں میں گم ہو کر   رمزِ وحدت کو بھول جاتا ہوں
کیا فسوں ہے تری تمنائیں!   داغِ حسرت کو بھول جاتا ہوں
چاند ہے، وہ ہیں، تختۂ گل ہے   باغِ جنت کو بھول جاتا ہوں
کود کر عشق کے سمندر میں
اپنی ہمت کو بھول جاتا ہوں

۱۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء

نقشِ عبرت ہوں اک زمانے میں   چرخ کوشاں ہے کیوں مٹانے میں؟
شکوۂ جورِ آسماں کیسا!   برق پنہاں ہے آشیانے میں
کل چمن میں تھا، اب قفس میں ہوں   ہے کشش کیسی آب ودانے میں!
دو گھڑی اور انتظار اے موت!   کچھ توقف ہے ان کے آنے میں
چشم حیرت زدہ ہے کیوں یارب!   تیری قدرت کے کارخانے میں

توڑ ڈالا اس کا دل ظالم!
کیا برائی تھی مسکرانے میں!

۱۹ نومبر ۱۹۲۳ء

مری ہر سانس کو سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں
مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

گماں کاشانۂ رنگیں کا ہے جس پر نگاہوں کو
اُسے اہلِ نظر گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

الٰہی! کشتیٔ دل بہ رہی ہے کس سمندر میں!
نکل آتی ہیں موجیں ہم جسے ساحل سمجھتے ہیں

طرب انگیز ہیں رنگینیاں فصلِ بہاری کی
مگر بلبل انہیں خونِ رگِ بسمل سمجھتے ہیں

پگھل کر دل لہو ہو ہو کے بہہ جاتا ہے آنکھوں سے
ستم ہے شمع کو جو زینتِ محفل سمجھتے ہیں

کہاں ہوگا ٹھکانا برق رفتارانِ وحشت کا!
کہ وہ منزل کو بھی سنگِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

بگولے اڑ رہے ہیں جو ہمارے دشتِ وحشت میں
انہیں کو اے اشرؔ ہم پردۂ محمل سمجھتے ہیں
۲۳ر دسمبر ۱۹۲۳ء

صحنِ گلشن میں بھی قرار کہاں! آہ! وہ پیکرِ بہار کہاں!
شام ہے میں ہوں یاس و نومیدی اب وہ فردوسِ انتظار کہاں!
اب کہاں ابتدائے عشق کے لطف! اب وہ گلہائے نو بہار کہاں!
ایک خاکسترِ سیاہ ہے دل اب وہ شعلے کہاں! شرار کہاں!
آؤ آؤ کہ پھر ملیں نہ ملیں، زندگانی کا اعتبار کہاں!

اے اشرؔ کس خیالِ خام میں ہو!
تم کہاں! بزمِ شہریار کہاں!
۱۵ر اپریل ۱۹۲۴ء

کیا سحر تھے کسی کی نگاہوں کے تار میں بھر دیں ہیں بجلیاں جو دلِ بیقرار میں

ہے برقِ حسن باعثِ صد اضطرابِ دل لیکن وہی ضیا بھی ہے شبہائے تار میں

دل پر کبھی اختیار نہیں ہے جو تم نہیں تم ہو تو چرخ بھی ہے مرے اختیار میں

ہے برقِ اضطرار کبھی سازِ بیقرار کیا کیا ہیں اضطرابِ دلِ بیقرار میں!

سمجھاؤں کسطرح سے دلِ بیقرار کو ؟ تم اختیار میں ہو، کہ دل اختیار میں!!

آخر ابد کی نیند وہ تھک کے سو گیا جھپکی نہ جس کی آنکھ شبِ انتظار میں

جب یہ خزاں بھی ایک فریبِ نگاہ ہے بہتر ہے مبتلا ہوں فریبِ بہار میں

اسکی خزاں پہ لاکھ بہاریں نثار ہوں وہ رشکِ صد بہار ہو جسکے کنار میں

آنکھوں کو جستجو ہے تری، اور تو نہیں کیونکر نہ ہو جنوں مجھے فصلِ بہار میں

پیتے ہیں جھوم جھوم کے رندانِ بادہ نوش رحمت کو دیکھ دیکھ کے ابرِ بہار میں

منزل بہت قریب تھی، پر کیا کروں اثرؔ

تاریکیوں نے گھیر لیا رہگذار میں ۹ / نومبر ۱۹۲۴ء

آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تری رہگذار میں! آغوشِ شوق وا ہے ترے انتظار میں!

تیری جھلک پہ لاکھ بہاریں نثار ہوں
جلووں سے اپنے آگ لگا دے بہار میں!!

تو ہو تو خار خار بھی ہے مجھکو پھول پھول!
تو ہو تو خلد خلد ہے ہر شاخسار میں!

ہر شاخ پر ہے مستیٔ رقص نگارِ گل
ساغر چھلک رہا ہے کفِ میگسار میں!

موجِ فنا کا دم ہے رفتارِ موج پر
موجِ فنا کہاں ہے یم بیقرار میں؟

دھندلے سے نقش دل میں محبت کے رہ گئے
رونق ہے کچھ انہیں سے اس اجڑی دیار میں

پھر مسکرا رہی ہے کسی کی نگاہِ ناز
شعلے بھڑک اٹھے ہیں دلِ بیقرار میں

تو نے اسے متاعِ گرامی بنا دیا
رکھا ہی کیا تھا زندگیٔ مستعار میں

بس بس کے دل ہمارا کچھ ایسا اجڑ گیا
آئی نہ پھر بہار اس اجڑے دیار میں

تو ایکدن بھی ہو نہ سکا مائلِ کرم!
قیدِ حیات کاٹی اسی انتظار میں

اتنا تو تیرے دردِ محبت نے کر دیا
اب کا ہشیں نہیں ہیں غمِ روزگار میں

پیتا بھی ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں ای اشک
دونوں میں اک سرور ہے فصلِ بہار میں

۵ر دسمبر ۱۹۲۷ء

یا ڈوب جائیں لب مرے موجِ شراب میں!
یا موسمِ بہار نہ آئے شباب میں!!

اس لب پہ ہے ضیائے تبسم عتاب میں
اک رنگِ لطف ہے خلشِ اضطراب میں

ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگِ حجاب میں
یا کوئی نو شگفتہ کلی نیم خواب میں!

عقدہ کھلا ہے آج یہ عہدِ شباب میں
کچھ بھی نہیں ہے فرق گناہ و ثواب میں

انگڑائی لیتے اٹھے جو وہ خوابِ ناز سے
ہر چیز غرق ہو گئی رنگِ شباب میں

رنگینیوں میں غرق ہوئی ہے نقاب بھی
تم ہو کہ آفتاب چھپا ہے سحاب میں!

کیا حسن پھوٹ پھوٹ کے نکلا نقاب سے!
کیا خوب بے نقاب ہوئے ہو نقاب میں!

اب آرزو یہی ہے کہ اے مطربِ حسیں!
ہو جاؤں جذب زمزمہ ہائے رباب میں

جس حسن کی ہے چشمِ تمنا کو جستجو
وہ آفتاب میں ہے نہ ہے ماہتاب میں

اے وائے شب! کہ خوابِ پریشاں میں ختم ہو
اے وائے دن! کہ صرف ہوا اضطراب میں

یا رب! ہو ان کو خوف بھلا کیا عذاب کا
جنکی تمام عمر کٹی ہو عذاب میں

ہستی کو پھونک دینگے آتشِ شعلہائے عشق
خاکِ سیاہ ہو کے رہو گے شباب میں

۲۵ مارچ ۱۹۲۵ء

زبانِ خامشی سے شوقِ بے پایاں بیاں کرلوں
نگاہِ پاک بیں کو رازِ دل کا ترجماں کرلوں

وہ فردوسِ تماشا زینت آرائے گلستاں ہے!
نظر میں کس طرح سے جذب سب رنگینیاں کرلوں!!

خیالِ جنتِ موہوم میں اے واعظِ ناداں!
نظر کو کس لئے بیگانۂ حسنِ بتاں کرلوں؟

غریقِ بادۂ رنگیں ہوئی ہے محفلِ ہستی
شبابِ عارضی کو کس طرح سے جاوداں کرلوں؟

وہ مستِ ناز ہے، یا پیکرِ رنگینی و مستی!
یہی جی چاہتا ہے اس کو آنکھوں میں نہاں کرلوں!!

کبھی تاروں بھری راتوں میں یوں بھی غور کرتا ہوں
دلِ تاریک کو کیسے حریفِ کہکشاں کر لوں!
اشو جب ہاؤہوئے رندِ مے آشام سنتا ہوں
یہی جی چاہتا ہے بیعتِ پیرِ مغاں کر لوں ۶ اپریل ۱۹۲۵ء

15916

ہنگامہ ہائے رونقِ دنیا کو کیا کروں! | میں آدیدہ رنگِ تماشا کو کیا کروں!
کم کر سکے نہ کچھ بھی اگر کاہشِ فراق، | اس گلستانِ گنبدِ مینا کو کیا کروں!
کیا کیا ہیں میرے دل میں خلشہائے جستجو! | ذوقِ نظر کو، دیدۂ بینا کو کیا کروں!
پھر اضطرابِ کشمکشِ موت و زیست ہے | حسنِ طلسمِ وعدۂ فردا کو کیا کروں!
پیشِ نظر نہیں ہے وہ سرمایۂ نشاط | آغوشِ جام و گردنِ مینا کو کیا کروں!
اب خاک ہو کے بھی ہیں وہی بیقراریاں | اے حسنِ دوست! تیری تمنا کو کیا کروں!
اندوہِ زندگی کا مداوا اگر نہیں | آبِ حیات و دستِ مسیحا کو کیا کروں!

سیلابِ اضطراب ہے رگ رگ میں آہ آج

۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء

اس دل کے شعلہ زارِ تمنّا کو کیا کروں!

لطف گناہ میں ملا، اور نہ مزہ ثواب میں

عمر تمام کٹ گئی کاوشِ احتساب میں

تیرے شباب نے کیا مجھکو جنوں سے آشنا!

میرے جنوں نے بھر دیئے رنگ ترے شباب میں!!

آہ یہ دن کہ جانگداز جوششِ اضطراب ہے!

ہائے وہ دور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں!!

قلب تڑپ تڑپ اٹھا، روح لرز لرز گئی،

بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمزمۂ رباب میں

چرخ بھی مے پرست ہے، بزمِ زمیں بھی مست ہے،

غرق بلند و پست ہے جلوۂ ماہتاب میں،

میرے لئے عجیب ہیں تیری یہ مسکراہٹیں!
جاگ رہا ہوں یا تجھے دیکھ رہا ہوں خواب میں!!
میرے سکوت میں نہاں ہے مرے دل کی داستاں
جھک گئی چشمِ فتنہ زا، ڈوب گئی حجاب میں
لذتِ جامِ جم کبھی تلخیٔ زہرِ غم کبھی
عشرتِ زیست ہے اسیرِ گردش و انقلاب میں
۲۳ رجون ۱۹۲۶ء

جو شناسائے سوز و ساز نہیں | محرمِ لذتِ گداز نہیں
رات پیرِ مغاں نے فرمایا | جو نہیں مست، پاکباز نہیں
آپ سرکارِ ناز ہی ٹھہرے | دل مرا خوگرِ نیاز نہیں
میری ہستی بھی اک معمہ ہے! | راز ہوں آشنائے راز نہیں،
ہائے کوتاہ دستیاں میری! | ہاتھ میں گیسوئے دراز نہیں،
کیوں بتوں کی جفا سے گھبرائیں! | کیا خدا اپنا کارساز نہیں!

ساقیا! تیرے رند ہیں کم ظرف
ورنہ پینے سے احتراز نہیں
بارگاہِ کرم میں صہبائی!
رند و زاہد میں امتیاز نہیں
۱۵ فروری ۱۹۲۷ء

شوخیٔ حسن نازنینوں میں
مے چھلکتی ہے آبگینوں میں
اب الٹ دے نقابِ عارض کو!
سجدے بیتاب ہیں جبینوں میں!!
سنگِ اسود میں ڈھونڈھتا ہے جسے
جلوہ پیرا ہے وہ حسینوں میں
انجمستانِ حسن ہے گویا،
عشق کے داغ ہیں جو سینوں میں
حسن ہی حسن جلوہ فرما ہے
آسمانوں میں اور زمینوں میں
بزمِ انجم میں نغمہائے بہار
رقص ہے عرش کے مکینوں میں
کارفرمائی جنوں دیکھو!
اب گریباں ہیں آستینوں میں
اے اختر لطفِ مے پرستی ہے!
شبِ مہتاب، مہ جبینوں میں
۶ مارچ ۱۹۲۷ء

لبوں پہ ہے تبسم، آ رہے ہیں
وہ گلہائے ارم برسا رہے ہیں

فضائیں عاشقی کی جھومتی ہیں
وہ زلفِ عنبریں لہرا رہے ہیں

وہ متوالی نگاہوں کا تبسّم!
فضائے دل پہ نشّے چھا رہے ہیں

کہاں کعبہ! کہاں خمخانۂ عشق!
یہ صہبائی کو کیوں بہکا رہے ہیں؟

۱۵ اگست ۱۹۲۷ء

ایسا بھی کوئی لمحہ ہو شام و پگاہ میں
وحشت ہو سازِ عیش سے، لذّت ہو آہ میں

ہیں تیرے سوز سے تری رعنائیاں فزوں
میں بھی ہوں ایک شمع تری جلوہ گاہ میں

تیرے بغیر رنگِ سحر بھی سیاہ ہے
تُو ہے تو آفتاب ہے شامِ سیاہ میں

اس رند پر نثار ہزاروں عبادتیں!
حاصل ہے جسکو قُرب تری بارگاہ میں

تاریک تر ہے روح جو تو جلوہ گر نہیں
یوں تو ہزار جلوے ہیں میری نگاہ میں

وہ کاروانِ ناز تو کوسوں نکل گیا
گم شیخ و برہمن ہیں مگر گردِ راہ میں

مقصودِ زندگی ہے فقط تیری آرزو
اب کوئی میکدہ میں ہو یا خانقاہ میں

آئینہ دارِ حسن ہیں حیرانیاں مری
آئینہ بن گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں

گلہائے نوبہار میں ہے کس کا رنگ و بُو!
کس کا فروغِ حسن ہے خورشید و ماہ میں!!

لذّت اگر نہیں ہے عبادت میں نہ ہو!
کھُل جاؤ پھر کہ کچھ تو ہے لذّت گناہ میں

اسکی تباہیوں پہ مری راحتیں نثار!
جس لب پہ تیرا ذکر تھا حالِ تباہ میں!!

ہر چند جانتا ہوں فریبِ نگاہ ہے
میں پھر بھی مبتلا ہوں فریبِ نگاہ میں

سجدے کئے حضور کو معبود جان کر
کافر تو ہوں ضرور، مگر کس گناہ میں!

ان کے تبسّمات قیامت کے ہیں اشارے!
سو سو تبسّمات ہیں جن کی نگاہ میں،
۱۱ مارچ ۲۷ء

نہ نقاب ہو نہ حجاب ہو، مرے دل میں جلوہ طراز ہو!
مرا قلبِ پاک ایسا بنے ترا حسن صورتِ راز ہو!

یہ بجا نہیں تری سرکشی، کہ یہی ہے شیوۂ بندگی،
جو ہو دل تو صرفِ گداز ہو، جو ہو سر تو وقفِ نیاز ہو

سرِ شام شیشۂ آب میں ہے شفق کا عکس جھلک رہا
کوئی میری خلوتِ دل میں کبھی یونہی کاش جلوہ طراز ہو!
جو حدیثِ درد کروں بیاں، تو سکوت ہو مرا راز داں
وہی ایک میرا انیس ہو، وہی ایک محرمِ راز ہو
ہو فنا کی نیند تو خواب میں، وہ نگارِ حسن ہو سامنے
یہ حدیثِ عشق، فسانہ گو! مری زندگی سے دراز ہو
جو شکستہ شیشۂ دل ہوا، تو اثرؔ ملول نہ ہو ذرا
تجھے کیا خبر کہ وہی نگاہ، نگاہِ آئنہ ساز ہو!

۲۵ دسمبر ۱۹۲۲ء

آہ! وہ نقش و نگارِ آرزو! — آہ! وہ جوشِ بہارِ آرزو!
آہ! وہ گلہائے عشرت کا فسوں! — آہ! وہ بانگِ ہزارِ آرزو!
آہ! وہ ہنگامۂ بزمِ طرب! — آہ! وہ بوس و کنارِ آرزو!
آہ! وہ کیفِ مئے حسنِ خیال! — آہ! یہ رنگِ خمارِ آرزو!

اب کہاں وہ رقص ہلئے بیخودی؟ ہوگیا خاموش تارِ آرزو!
اب کہاں وہ شورشِ پیہم کے لطف؟ اب کہاں وہ خلفشارِ آرزو؟
ہوگیا ہے کس لئے غرقِ سکوت؟ کیا ہُوا اے بیقرارِ آرزو!
کیا طلسمِ حسن ہے لیکن اثرؔ!
ہے ابھی تک اعتبارِ آرزو

۱۰ جولائی ۱۹۲۴ء

مل گیا تیرا آستاں مجھکو جھک کے ملتا ہے آسماں مجھکو
فصلِ گل میں بھی برق کا کھٹکا! ایک زنداں ہے آشیاں مجھکو!!
تُونے جس دل کو خون کر ڈالا، ہے وہی جامِ ارغواں مجھکو
پھر وہی آستاں، وہی میں ہوں بیخودی لے گئی کہاں مجھکو!
اس مہِ حسن کی شعاعوں نے کر دیا بحرِ بیکراں مجھکو
بزمِ ہستی میں بھی رہا تنہا، نہ ملا کوئی رازداں مجھکو،

دشت پیما ہوں بیخودی میں اشکؔ
دل یہ لیجائے اب جہاں مجھکو
یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء

بوئے گیسو جو کبھی حسن کی غماز نہ ہو ۔ وادیٔ عشق میں یوں لطف تگ و تاز نہ ہو
خاک ہو جاؤنگا جل جاؤنگا مٹ جاؤنگا ۔ دیکھ اے پردہ نشیں! پردہ یہ انداز نہ ہو!
آشیاں دیکھ کے ہوتے ہیں کشادہ بازو ۔ دام کہتا ہے مگر مائل پرواز نہ ہو
ساقیا! جام عطا ہو کوئی ایسا مجھکو ۔ گردش شام و سحر پھر خلل انداز نہ ہو
زندگی عالم مستی میں گذر جائے اگر ۔ فکر انجام نہ ہو، کاوش آغاز نہ ہو
روح کیوں مائل پرواز ہی ہنگام سماع! ۔ ساز مطرب میں کہیں تیری ہی آواز نہ ہو!!
زندگی ایک فسانہ ہے سودہ بھی ایسا ۔ جسکا انجام نہ ہو، جسکا کچھ آغاز نہ ہو

شیوۂ اہل وفا جور پرستی ہے اشکؔ
ٹوٹ جائے جو کبھی دل بھی تو آواز نہ ہو
۲۵ دسمبر ۱۹۲۴ء

یوں بے حجاب ہو کے پلا آج ساقیا! ۔ طاری جنوں کا رنگ ہو ایسا سرور ہو

منظور ہیں ہمیں تو فقط خود فروشیاں — پیرِ مغاں کا جام ہو یا برقِ طور ہو

یاروں کے یار حضرتِ زاہد بھی ہیں اگر — مے بھی مئے طہور ہو ساقی بھی حور ہو

ایسا بھی ہو نہ کوئی زمانے میں اے خدا! — زخمی ہو پائے شوق بھی، منزل بھی دور ہو

ابتک اسی کا ہے دلِ ناداں کو انتظار — اس کی بلا سے کوئی اگر ناصبور ہو

کمبخت دل کو پھر بھی تمہاری ہے آرزو — گو دستِ نارسا سے نہایت ہی دور ہو

بے وجہ ہیں وہ ہم سے خفا تو ہوا کریں
ہم کیوں منائیں؟ کوئی ہمارا قصور ہو

۲۸ دسمبر ۱۹۲۵ء

زیرِ نقاب بھی تو بہت بے نقاب ہو — ہو جاؤ بے نقاب کہ تم آفتاب ہو!

ہے فصلِ برشگال میں رندوں کی آرزو — مطرب ہو، دورِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو!!

اس مست کیلئے کوئی تعزیر کیوں نہیں؟ — بڑھکر شرابِ ناب سے جسکا شباب ہو

رحمت کے ابر جھوم کے اُٹھے ہیں میکشو! — سجدے میں اب گرو کہ دعا مستجاب ہو

رنگین و پُر بہار گذر جائے زندگی! — یہ خواب ہے اگر، تو محبت کا خواب ہو

تسکیں کو رو رہے تھے بہت اضطراب میں
اب دل کو اضطراب ہی پھر اضطراب ہو

زاہد کو کھا گیا ہے اثرؔ میکشوں کا غم
قسمت اپنے تو کوئی، کسی کو عذاب ہو
۲۱ اگست ۱۹۲۶ء

تیرا جمال، رونقِ ایوانِ آرزو،
تیرا خیال، مطلعِ دیوانِ آرزو،

پھر بن رہا ہے مرکزِ طوفانِ آرزو
وہ دل، کہ ہو چلا تھا پشیمانِ آرزو

پروانہ، آفتاب ہے جس شمعِ حسن کا
ہے میری ہی وہ شمعِ شبستانِ آرزو

وہ نزہتِ بہارِ چمن جلوہ ریز ہے
دامانِ گلفروش ہے دامانِ آرزو،

اک نغمہ زارِ عشق ہے، اک جلوہ زارِ حسن
اللہ رے ابہارِ گلستانِ آرزو،

ہے نشہ اس کا نشۂ صہبا سے تیز تر
صہبا سے بے نیاز ہیں مستانِ آرزو

پھر آرہا ہے لب پہ تبسم لئے ہوئے
وہ کعبۂ خیال، وہ ایمانِ آرزو،

پھر برسرِ کرم ہے اثرؔ چشمِ میفروش
پھر کھل رہا ہے بابِ خمستانِ آرزو،
۲۳ اگست ۱۹۲۶ء

خود ہی میخوار، خود ہی میخانہ
خود ہی ساقی ہوں، خود ہی پیمانہ

میں ہوں اور جامہائے بادۂ حسن
میں ہوں اور نغمہائے مستانہ

میں ہوں اور نعرہائے نوشانوش
میں ہوں اور ہاؤ ہوئے دیوانہ

بے نیازِ سبو و ساقی ہوں،
محفلِ دل ہے رشکِ میخانہ

اے اتش اہلِ خرقہ و تسبیح

۱۲ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء

خاک سمجھیں رموزِ رندانہ، !

تقدیر کا گلہ بھی تو کرنا نہیں مجھے
الزام سر پہ غیر کے دھرنا نہیں مجھے

موجود بھی ازل سے ہوں اور جاوداں بھی ہوں
خوفِ فنا نہیں ہے کہ مرنا نہیں مجھے

ساحل پہ جاؤنگا بھی تو موجوں کو چیر کر
کشتی کے بل پہ پار اترنا نہیں مجھے

منزل مری بلند ہے خورشید و ماہ سے
خورشید و ماہ پر ہی ٹھہرنا نہیں مجھے

ہے کائنات ایک صنم خانۂ جمال،
نذرِ مجاز روح کو کرنا نہیں مجھے

طوفانِ اضطراب ہوں منزل کہیں نہیں
بہتا ہوں برق وار ٹھہرنا نہیں مجھے

مسجودِ مہر و ماہ ہوں، معبودِ کائنات — سجدہ کسی کے در پہ بھی کرنا نہیں مجھے
خورشید وار مجھ کو چمکنا ہے ایکدن — راتوں کو آہ آہ ہی کرنا نہیں مجھے
گرتا ہوں بار بار، ابھرتا ہوں بار بار — کہتا ہے کون گر کے ابھرنا نہیں مجھے!
ہر گام پر ہجومِ مصیبت سہی، مگر — ہے اقتضائے عشق کہ ڈرنا نہیں مجھے

رہ جائیگا گلوں میں مرا رنگ و بو اثر!
موجِ صبا کی طرح گذرنا نہیں مجھے

۲۰ جون سنہ ۱۹۲۸ء

چشمِ مشتاقِ دیدِ یار رہی، — شام تک محوِ انتظار رہی
رات کا قصّہ مختصر یہ ہے — صبح ہونے تک اشکبار رہی
تو رہا محوِ خوابِ ناز، مگر — آرزو میری بیقرار رہی
گو تغافل ترا شعار رہا — مجھ کو امید بار بار رہی
راز سمجھا نہ کچھ گلِ خنداں — کس لئے شبنم اشکبار رہی!

ق

اے اثرؔ لطفِ زندگی کیا ہے!

۲۱ مئی ۱۹۲۱ء

خشمگیں جب نگاہِ یار رہی!

تری نگاہ اگر ایک بار ہو جائے
دلِ فسردہ سراپا بہار ہو جائے

عجیب چیز ہے اس غمکدے میں مستی بھی
جسے نصیبِ دلِ میگسار ہو جائے!

تری نگاہِ محبت نواز کا ہے فسوں
کہ دل کا قطرہ یم بیکنار ہو جائے

قضا ہی آئے کہیں، نامہ بر نہیں نہ سہی
کچھ آج فیصلہ انتظار ہو جائے!

نگاہِ یار کی جادو طرازیاں ہیں اثرؔ!

خزاں ہے دم میں، تو دم میں بہار ہو جائے

رگ رگ میں اک سرور ہے سوز و گداز سے

نغمے نکل رہے ہیں مرے دل کے ساز سے

کیا جانے کیا خزانہ ملا ہے کہ اہلِ درد،

دونوں جہاں سے ہو گئے کچھ بے نیاز سے

پرتو ہیں ایک حسن کے رند اور محتسب

بالا مری نظر ہے نشیب و فراز سے

پھر جگمگا رہی ہے مری بزم آرزو،

دیکھا کسی نے پھر نگہِ دلنواز سے

پھر خندہ زیرِ لب کوئی آتا ہے ای اشک

پھر جھک رہا ہے سر مرا جوشِ نیاز سے

یکم دسمبر ۱۹۲۲ء

شام آئی کب نہ جانئیے اور کب سحر ہوئی!

تیرے خیال میں نہ مجھے کچھ خبر ہوئی

او مستِ خوابِ ناز تجھے بھی خبر ہوئی!

کیونکر شبِ فراق کسی کی بسر ہوئی!

ق

بیمارِ غم خموش تھا، دنیا اداس تھی،

آخر سحر ہوئی بھی تو ایسی سحر ہوئی!

پھر بر سبیلِ ذکر جو نام اس کا آ گیا
بزمِ خیال پھر مری زیر و زبر ہوئی

ہر داغ تیری یاد میں رشکِ چمن ہوا
ہر سانس میری نغمۂ بادِ سحر ہوئی

کس نامراد کا یہ شکستہ مزار ہے!
او رونے والے! اسکی بھی تجھکو خبر ہوئی!

پھوٹے ہوئے نصیب تھے اپنے ہی اے آتش
اسکی نگاہِ لطف تو ہر ایک پر ہوئی

۳ دسمبر ۱۹۲۲ء

ہو چکے ہم دل شکستہ کامرانِ زندگی
اب مٹا دے اے فلک نام و نشانِ زندگی!

جلوۂ گل ہے نہ اب وہ نغمۂ فصلِ بہار
پھونک دے اے برق میرا آشیانِ زندگی!

وا ہوئی خوابِ عدم سے جب یہ چشمِ آگہی
تھا تلاطم خیز بحرِ بیکرانِ زندگی،

ہے نہ آغازِ سفر کی، اور نہ منزل کی خبر
کیا معمّا ہے الٰہی! کاروانِ زندگی!

موت بھی باب حیات جاوداں ہے انجذ! ختم بھی ہوگی کہیں یہ داستانِ زندگی!
غرق بھی ہوجا کہ دریائے فنا ہے موجزن دلمیں ابتک کاوشِ سود و زیانِ زندگی!

او تغافل کیش! تونے بھی کبھی سوچا کہ کیوں
ہوگیا آخر اثر بھی نوحہ خوانِ زندگی!

۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء

بیقراری ہے، آہ و زاری ہے واہ! کیا زندگی ہماری ہے!
سلسلہ ہے کشش کا کیا یارب! ذرّے ذرّے کو بیقراری ہے
اک تلاطم ہے بحرِ ہستی میں! جذبۂ عشق کسکا ساری ہے!!
جلوہ فرما ہزار رنگ میں ہے یہ تصوّر کی کامگاری ہے
دل، کہ گہوارۂ سکوں تھا کبھی محشرستانِ بیقراری ہے
زخمِ دل ہے، کہ چشمِ بینا ہے! زندگی ہے کہ بیقراری ہے!
پھر وہی بیخودی کا عالم ہے پھر وہی ذکر لب پہ جاری ہے
ساغرِ گل میں بادۂ شبنم! اہلِ باطن کی میگساری ہے

توہی جلوہ نما ہے ہر شے میں! یا محبت کی سحر کاری ہے!

اے آتش ہے اسی میں لذتِ زیست

یہ جو رگ رگ میں بیقراری ہے

۱۰ جون سنہ ۱۹۲۳ء

سینۂ ابر میں نہاں برق ہے یا شرار ہے!

ہے کوئی حسن تند خو، یا دلِ بیقرار ہے!

گونج رہا ہے سازِ دل نغمۂ جانفروز سے

تیری نگاہِ لطف بھی، زمزمۂ بہار ہے

شیشۂ آبجو میں ہے رنگِ شفق جھلک رہا

آئینۂ خیال میں عکسِ رخِ نگار ہے

اس کا زیاں زیاں نہیں، اسکی خزاں خزاں نہیں

جس کی شبِ سیاہ میں نقشِ خیالِ یار ہے

نورِ سحر اسی میں ہے ظلمتِ شب اسی میں ہے

گردشِ چشم ہی تری گردشِ روزگار ہے

سازِ سکوتِ شام سے نغمۂ مست ہے رواں
پیکرِ کیف و بیخودی عرصۂ روزگار ہے

رختِ حیات بندھ چکا، کوسِ رحیل بج چکا
آکے گلے لگا، کہ اب تیرا ہی انتظار ہے!

میری رگوں میں ہے رواں جوئے سرورِ جاوداں
بادۂ عشق بھی اثرؔ بادۂ مشکبار ہے

۱۷ اگست ۱۹۲۳ء

وہ رشکِ صد بہار آئے نہ آئے
ہمیں ہے انتظار آئے نہ آئے

لپٹ کر چوم لے پھولوں کو بلبل!
چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

کہاں ہے! ساقیٔ گلرو کہاں ہے!
گھٹا یہ بار بار آئے نہ آئے

وہ آئیں بھی تو کیا آنے سے حاصل
مجھے پھر بھی قرار آئے نہ آئے!!

اشک آئیوں حال دل کہہ کر سبک ہوں
۲۰ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء
کسی کو اعتبار آئے نہ آئے،

جلوہ آرا ہوئی سحر میری   روح تاریک ہے مگر میری،
یہ بجا، آفتاب نکلا ہے   یہ غلط، ہوگئی سحر میری؛
حسن کے موجزن سمندر میں   روح تشنہ ہے کسقدر میری!
آہ! وہ پیکر بہار کہاں !   ڈھونڈھتی ہے جسے نظر میری
ہو ہم آغوش اگر وہ خرمن گل   شام میری ہے پھر سحر میری

کب مرا آفتاب نکلے گا ! ! !
۱۵ فروری سنہ ۱۹۲۴ء
کب سحر ہوگی اے اشک میری!

کس چیز کا جویا ہوں کس بات کا سودا ہے!
معلوم نہیں مجھ کو، کیا میری تمنّا ہے!
اک لرزش پیہم ہے، بربط مری ہستی کا،

گاہے ہمہ نغمہ ہے، گاہے ہمہ نالا ہے!

سیلابِ تبسم ہے، ساقی کی نگاہوں میں

ساغر مرا ساغر ہے، صہبا مری صہبا ہے

پھولوں کی فراوانی، نغموں کا تلاطم ہے

اک حسن کی دنیا ہے، اک عشق کی دنیا ہے

بیگانۂ وحدت ہے، تیری ہی نظر ورنہ

کعبے میں ہے بتخانہ، بتخانے میں کعبہ ہے

ہستی کے سمندر میں انساں کی حقیقت کیا!

موجوں کی کشاکش میں بہتا ہوا تنکا ہے

راضی بہ رضا ہونا ہے خوب، اثرؔ لیکن

ایسا نظر آتا ہے، ناکامِ تمنا ہے

۳۰ اپریل ۱۹۲۴ء

میکدے میں شراب باقی ہے آسماں پر سحاب باقی ہے

پے بہ پے جام مے چلے ساقی! ابھی رنگِ شباب باقی ہے،
اب تمنا تو دل میں کوئی نہیں، مگر اک اضطراب باقی ہے
خاک مرجھا کے ہوگیا ہے مگر موجِ بوئے گلاب باقی ہے
ق
مہر کی شوخیاں ہوئیں معدوم جلوۂ ماہتاب باقی ہے
تو نہیں، یاد سے مگر تیری دلمیں کچھ آب و تاب باقی ہے
ساقیا! ختم ہوگئی ہے کیا! آہ! خانہ خراب باقی ہے
میکدے میں بھی اے آشؔ افسوس!
کاوشِ احتساب باقی ہے

۲۵/اپریل سنہ ۱۹۲۴ء

تمہاری یاد میں بزمِ جہاں کو بھول گئے
زمیں کو بھول گئے، آسماں کو بھول گئے

کچھ اس ادا سے عروسِ بہار آئی ہے
ستم کشانِ خزاں بھی خزاں کو بھول گئے

قفس میں ذوقِ اسیری سے ہے بڑھ گیا اتنا
چمن کو بھول گئے آشیاں کو بھول گئے

ستم فلک نے وہ توڑے ہیں اے اثرؔ ہم پر
کہ شوقِ زندگیٔ جاوداں کو بھول گئے
۱۶ مئی ۱۹۲۴ء

ہنگامِ سحر خنداں تقدیر نظر آئی — یہ خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی ،
تاریک ہوئی دنیا دم گھٹنے لگا میرا — آہوں کی یہی مجھکو تاثیر نظر آئی ،
اغیار کی محفل میں وہ زینتِ محفل ہیں — یہ خوابِ تمنا کی تعبیر نظر آئی ،
اُف ایک قیامت تھا محفل سے نکل جانا! — جو چیز نظر آئی ، دلگیر نظر آئی ،
ہر گام پہ جھک جھک کر کی میں نے جبیں سائی — ہر نقش میں مجھکو اک تصویر نظر آئی ،

اس محوِ تغافل سے لاکھوں تھے گلے، لیکن
سوچا تو اثرؔ اپنی تقصیر نظر آئی
۲۳ اگست ۱۹۲۴ء

پلائے جا ساقیا! پیاپے پلائے جا انتظار کیا ہے!
جو لڑکھڑا جائے ایک دو ساغروں میں وہ بادہ خوار کیا ہے!

چمن میں رقصِ طرب بپا ہے، رباب ہاتھوں میں تھام مطرب!
عبث ہیں یہ کاوشیں ترے دلمیں پھول کیا ہیں؟ بہار کیا ہے؟

لپٹ لپٹ کر گلوں کو ہم چوم لینگے اے نوحہ خوانِ گلشن!
بہار ناپائدار، لیکن ہمارا بھی اعتبار کیا ہے!

ازل سے خورشید و ماہ کے جام بزمِ ساقی میں چل رہے ہیں
مرید پیرِ مغاں کی نظروں میں دورِ لیل و نہار کیا ہے!

کسی کو میخوار کر دیا ہے، کسی کو واعظ بنا دیا ہے
اثر اسی کے ہیں سب کرشمے کسی کا کچھ اختیار کیا ہے؟

۹ جنوری سنہ ۱۹۲۵ء

بے نیازی نگہِ حسن کرے یا نہ کرے
عشقِ ناکام مگر حسن کو رسوا نہ کرے

منزلِ عشق ملے یا نہ ملے، دل لیکن
ترکِ آوارگیٔ دشتِ تمنا نہ کرے

طلبِ چشمۂ حیواں میں پھرے دشت بدشت
دل اگر پیروئ خضر و مسیحا نہ کرے

بے نیازی سے رہے وقفِ جہنم لیکن
جھک کے توبہ کی ندامت کو گوارا نہ کرے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اس ساقئ دریادل کو
میرے ویراں کدۂ دل کو جو مینا نہ کرے

مستیاں میکدۂ حسن کی اللہ اللہ !!
یہ نشے قلزمِ صہبا کبھی پیدا نہ کرے

دستِ نازک سے مجھے خود ہی سنبھالے ساقی
کام ایسا بھی کبھی لغزشِ مستانہ کرے

سر وہی سر ہے نہ ہو جس میں خمارِ غمِ دوش
دل وہی دل ہے جو اندیشۂ فردا نہ کرے

رازِ ہستی سے ہے کچھ کچھ وہی آگاہ اشرؔ
جو کبھی بھول کے فکرِ غمِ دنیا نہ کرے
۶ رجون سنہ ۱۹۲۵ء

منزل مری کہاں ہے؟ نہیں کچھ خبر مجھے
ذوقِ سفر ہی رکھتا ہے گرمِ سفر مجھے
جھک جھک کے دیکھتا ہوں میں طوبےٰ کو، عرش کو،
کچھ اسقدر بلند ملی ہے نظر مجھے!

زندانِ کائنات میں گھبرا گیا ہوں میں
طوقِ گلو ہے حلقۂ شام و سحر مجھے

ہے اضطرابِ رقص مرا اضطرابِ دل
بیتابیٔ حیات ہے رقصِ شرر مجھے

پروازِ شوق کی نہ رکی گی نہ رک سکی
گو آسماں نے کر دیا بے بال و پر مجھے

ناآشنائے لذتِ حیرانیٔ نگاہ
کیوں دی ہے آشنائے حقیقت نظر مجھے!

دیکھو تو! میں بھی کس کا ہوں آئینہ دارِ حسن!
کہتا ہے ذرہ ذرہ یہی روک کر مجھے

وہ برق رو ہوں وادیٔ ہستی میں اے اثرؔ!
رہبر سمجھ رہا ہے مرا راہبر مجھے

۱۰؍اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

طوفِ حرم نہ سجدۂ بتخانہ چاہیئے
آزادہ رو کو مسلکِ رندانہ چاہیئے

یا رفعتِ فلک کی تمنا نہ چاہیئے
یا صدقِ شوق و ہمتِ مردانہ چاہیئے

بر آسکے، نہ یاس ہی اسکو مٹا سکے
ایسی بھی جانگداز تمنا نہ چاہیئے

میخانۂ جمالِ ازل کا ہوں بادہ نوش
مے چاندنی کی، چاند کا پیمانہ چاہیئے

واعظ کی حد سے بڑھ گئیں ہرزہ سرائیاں
اے مے پرست! نعرۂ مستانہ چاہیئے

ہوتا ہے کب نصیب کسی کو وصالِ حسن! اے ننگِ عشق! جرأتِ پروانہ چاہیئے

آغوشِ بیقرار کو معمور کیجیے آجائے جس سے غش وہ تجلی نہ چاہیئے

گھبرا کے عقل پوچھتی ہے بار بار اثر

کیا زخمہائے دل کا مداوا نہ چاہیئے؟ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۲۶ء

یا قلبِ مضطرب کو شکیبا نہ کیجیے! یا حسنِ فتنہ زا کا تماشا نہ کیجیے!

آدابِ حسن و عشق کو رسوا نہ کیجیے اس کعبۂ خیال کا شکوا نہ کیجیے

موقوف آرزو پہ ہے ہنگامۂ حیات مرجائیے پہ ترکِ تمنا نہ کیجیے

آبِ حیات میکدۂ دل میں ڈھونڈھیئے ناحق تلاشِ خضر و مسیحا نہ کیجیے

بیچارگی میں بھی ہے یہ طوفانِ آرزو! کچھ اختیار میں ہو تو کیا کیا نہ کیجیے!!

ہوتی ہے روح غرقِ محیطِ سکوت میں یوں بے حجاب سامنے آیا نہ کیجیے

آگاہ اپنی عظمتِ ہستی سے ہو اثر

پروائے تختِ قیصر و کسرا نہ کیجیے ۲۸ جون سنہ ۱۹۲۶ء

نہ محفل میں نہ تنہائی میں اب راحت کا ساماں ہے
کچھ ایسی وحشتیں ہیں، روح کچھ ایسی پریشاں ہے!
سحر تک دیکھنا! رنگ آسماں کیا کیا بدلتا ہے!
ابھی سے اسقدر آہیں، ابھی تو شام ہجراں ہے
تری باتوں سے تو اے شیخ ایسا جی نہیں جلتا
خدا غارت کرے اسکو کہ جو پی کر پشیماں ہے!
کچھ ایسی بیدلی چھائی ہوئی ہے میری ہستی پر،
نہ ذوقِ مے پرستی ہے، نہ لطفِ ذکرِ یزداں ہے
بہا کر لے گیا دیر و حرم کو ایک ہی رَو میں،
مرے بحرِ تخیل میں وہ آزادی کا طوفاں ہے
یہ دل اک داغ ہے، کتنا طلسم انگیز ہے لیکن!
کبھی صحن گلستاں ہے، کبھی صحرائے ویراں ہے

یہ کس حسن ترنم آفریں کو اک نظر دیکھا!

کہ میرے بربطِ دل کا ابھی تک تار لرزاں ہے

اسے آسودگی کو وہ کہاں، کس چیز میں ڈھونڈے!

کہ جس قسمت زدہ کا خواب بھی خوابِ پریشاں ہے

نومبر ۱۹۲۵ء

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرت خانہ ہے

اس بزم میں لیکن میرا بھی اک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ، نے بتخانہ ہے

ہاں! دو ہی سہارے ہیں ان کے، یا موت ہے یا پیمانہ ہے

بیگانۂ ہوش ہے "صہبائی" مستانہ ہے، دیوانہ ہے

ہاں! باتوں میں کچھ شوخی ہے اور شوخی بھی رندانہ ہے

ہر شاخ جب اک مستانہ ہے، ہر پھول جب اک پیمانہ ہے

توبہ! ایسے میں توبہ!! جب فطرت ہی میخانہ ہے

گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں، رحمت بن بن کر چھائی ہیں
آباد ہوئے ہیں میخانے، سجدے میں ہر اک مستانہ ہے

وہ دل کہ مہکتا رہتا تھا عشرت کے رنگیں پھولوں سے
تقدیر کی غارتگریوں سے ویرانہ سا ویرانہ ہے

کعبے میں، یا بتخانے میں یہ بات کہاں میخانے کی!
جو کام ہے آزادانہ ہے، جو بات ہے بیباکانہ ہے

کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے، میخانہ ہی کاشانہ ہے

گو ایک گدائے مست ہوں میں لیکن اک مستِ الست ہوں میں
ہیں چاند اور سورج پیمانے، دنیا میرا میخانہ ہے

یوں دادِ وفا کی ہوتی ہے، یوں مرنیوالے مرتے ہیں
اک داغ سا شمع کشتہ ہے خاکستر سا پروانہ ہے

برسات کی چاندنی راتوں میں دیکھئے تو کوئی صہبائی کو
لب پہ بھی مناجاتیں لاکھوں، ہاتھوں میں بھی پیمانہ ہے

۱۹۳۶ء

پھر وہی فتنۂ خنداں نظر آتا ہے مجھے
آہ! غارتگرِ ایماں نظر آتا ہے مجھے

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جانِ بہار!
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے

پھونک ڈالیگا مرے دل کو، مری ہستی کو
حسن اک شعلۂ لرزاں نظر آتا ہے مجھے

اب پشیماں ہوں میں تاثیرِ فغاں سے یارب!
حسنِ مغرور پشیماں نظر آتا ہے مجھے

میں سلیماں ہوں، یہ دنیا ہے مرے زیرِ نگیں
آسماں تختِ سلیماں نظر آتا ہے مجھے

رازِ ہستی کہ رہا چشمِ خرد سے مستور
آج اک جام میں عریاں نظر آتا ہے مجھے

حسن ہی حسن سے معمور ہے پہنائے جہاں
ہر طرف رنگِ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

چاندنی رات میں، اور صبحِ بہاراں میں اختر
حسنِ معصوم فراواں نظر آتا ہے مجھے

۱۸ ستمبر ۱۹۳۶ء

اب کہاں ہنگامۂ دورِ طرب محفل میں ہے! ہاں مگر اک آرزو تیری ابھی تک دل میں ہے

زندگی ہنگامہ آرا ہے اور دل راحت پسند روح مشکل میں ہے ہائے کسقدر مشکل میں ہے!

زندگی کا راز عشقِ بادیہ پیما سے پوچھ حسن کیا جانے کہ وہ خلوت نشینِ محمل میں ہے

تیرتی پھرتی ہیں نظریں حسن کی امواج میں اور دل ڈوبا ہوا رنگینیٔ محفل میں ہے

اک تماشا ہے مری بیتابیٔ وحشت کا رنگ اک قدم منزل پہ ہے اور دوسرا منزل میں ہے

بے نیازِ سازِ عشرت ہوں کہ ہنگامِ سحر ایک دنیائے تاثر نغمہائے دل میں ہے

موجِ طوفاں خیز میں ہے اضطرابِ زندگی اور سکونِ مرگ ہم آغوشیٔ ساحل میں ہے

کچھ اسی کے دم سے ہے ہنگامۂ ہستی اثرؔ

۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

"یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے"

دل کو درد آشنا کرے کوئی درد کو لا دوا کرے کوئی!

ایک جاں پر ہزارہا آفت پھر بھی شکرِ خدا کرے کوئی؟

جو کہے بے خطر کہے کوئی، جو کرے، برملا کرے کوئی،

نظرِ شوق تجھ کو ڈھونڈھتی ہے   دیر و کعبہ کو کیا کرے کوئی!

جسکا وعدہ ہو حشر پر موقوف   ایسی رحمت کو کیا کرے کوئی!

اپنی ہستی ہے مرکزِ عالم   دیدۂ دل بھی وا کرے کوئی

حکمِ یزداں، دعا کئے جاؤ

کب تک آخر دعا کرے کوئی!   ۲۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

کیا تاب ابرق کا جو تماشا کرے کوئی!

کیوں اہتمامِ پردۂ بیجا کرے کوئی!

انوارِ عشق کی ہوں مرے دلپہ بارشیں

اس خاکداں کو گنبدِ مینا کرے کوئی،

جب حسنِ کائنات ہو ایسا سرور خیز!

کیوں آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی!

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ حسن

لیکن نگاہِ شوق بھی پیدا کرے کوئی!

ہر چند ہے فریب، تمنا کا آب و رنگ

پھر بھی یہی بجا ہے تمنا کرے کوئی،

مانگی ہوئی حیات سے اچھی ہے موت ہی

کیوں التجائے خضر و مسیحا کرے کوئی؟

اے کاش! پھر نگاہِ خمستاں فروش سے

رگ رگ کو موجِ قلزمِ صہبا کرے کوئی،

کچھ شغل زندگی کے لئے بھی تو چاہیئے

تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی!

ہر جلوۂ حسیں پہ تڑپتا ہے برق دار،
اس بیقرار دل کو اشل کیا کرے کوئی!

۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء

جو شہیدِ نازنیں ہوتے گئے — داخلِ خلدِ بریں ہوتے گئے
حسن کی موجیں فزوں ہوتی گئیں — آپ جُوں جُوں خشمگیں ہوتے گئے
ہائے ان کا مسکرانا پیار سے! — روٹھنے میں جو حسیں ہوتے گئے
ہائے انکی شرمگیں نظروں کا رنگ! — اور بھی وہ دلنشیں ہوتے گئے
رات کی تاریکیاں گھٹتی گئیں — شب کو وہ ماہِ مبیں ہوتے گئے
ہے جوانی کسقدر ناز آفریں! — بھولے بھالے نازنیں ہوتے گئے
انکی نظریں بجلیاں بنتی گئیں — وہ قیامت آفریں ہوتے گئے
انکے عارض برگِ گل بنتے گئے — انکے کاکل سنبلیں ہوتے گئے
بارگاہِ حسن میں ہوں سجدہ ریز، — بُت الہ العالمیں ہوتے گئے

ہائے انکی آرزوئیں اے اثر!
جو جوانی میں حسیں ہوتے گئے

۲۲ر جنوری ۲۶ء

مائلِ لطف جو وہ نعبتِ چیں ہو جائے — رشکِ ارژنگ مرا قلبِ حزیں ہو جائے

اے دلِ زار! نہ کر شکوۂ بے مہریٔ دوست — ہائے کم بخت! اگر چیں بہ جبیں ہو جائے

دلِ ویراں کا ہر اک ذرّہ بنے شعلۂ طور — اک جھلک آج پھر اُو پردہ نشیں ہو جائے!

وہ نہ چاہے تو ہے تیرہ و تاریک حرم — وہ اگر چاہے تو دیدار کہیں ہو جائے

خوب ہے اس گلِ خوبی کے تصوّر کی بہار — آنکھ جس چیز پہ پڑ جائے حسیں ہو جائے

نقش سجدوں کے چمک اٹھیں ستاروں کی طرح — کہکشاں زار مری لوحِ جبیں ہو جائے!

تو خدا کو بھی بنا دیتا ہے پتّھر اے شیخ! — میں اگر دیکھوں تو پتّھر بھی حسیں ہو جائے

نام بھی لوں نہ کبھی ساغر و مینا کا اشکؔ
مجھ کو جنّت کا اگر کچھ بھی یقیں ہو جائے

۲۷ فروری ۶۲ء

کبھی میرے دلِ بیتاب کو یا رب قرار آئے!

بلا سے، باغِ ہستی میں خزاں آئے بہار آئے
ہزاروں انقلابِ گردشِ لیل و نہار آئے!

کبھی بھی ہوش میں لیکن ازل کے میگسار آئے؟

کبھی اے شیخ رندوں کی کرامت تونے دیکھی ہے!
اٹھے دستِ دعا اور جھوم کر ابرِ بہار آئے

کسی کو کیا کسی پر آسمانِ غم اگر ٹوٹے
کوئی آئے یہاں، کیوں اے ہجومِ انتظار آئے!

تری یاد اس طرح دل کی کلی کو گدگداتی ہے
کہ جیسے صبحدم موجِ نسیمِ مشکبار آئے

نہ جانے کیا کشش ہمکو یہانتک کھینچ لائی ہے!
تمہاری بزم میں آئے، مگر بے اختیار آئے!!

ترے جلووں کی مستی روح پرور کیف آور ہے!
جدہر دیکھے اٹھا کر آنکھ، ادہر فصلِ بہار آئے

اگر ہم سے نہ چھوٹی بحر پیمائی محبت کی
ہماری آرزوؤں کو بھی ساحل پر اُتار آئے

یکم مئی ۶۲ء

بزمِ جہاں ہے میکدۂ جم مرے لئے — ہے دورِ جام گردشِ پیہم مرے لئے

چھیڑا ہے کس کے حسن نے تارِ ربابِ عشق! — رقصاں ہے ایک نغمۂ پیہم مرے لئے

تیری نگاہِ لطف ہے موجِ مئے نشاط — اب ہوگئی حرام مئے غم مرے لئے

ہے دستِ شوق زلفِ معنبر میں شانہ کش — نکہت کدہ ہے محفلِ عالم مرے لئے

ہے کائنات تیری ضیا سے حسیں کہ تو — ہے آفتابِ حسنِ مجسم مرے لئے

ہر گل میں تیرا رنگِ تبسم ہے موجزن — آئینۂ جمال ہے شبنم مرے لئے

گلہائے نوبہار میں، خورشید و ماہ میں — تیرا جمال ہے متبسم مرے لئے

راحت سے ہمکنار ہوں پہنائے کائنات — گلپوش و زرنگار ہے ہر دم مرے لئے

تو ہمکنار ہے، تو خزاں بھی بہار ہے — کیا ہوگا پھر بہار کا موسم مرے لئے!

غرقِ سرورِ عشق ہوں شام و سحر اے شقیؔ
ہے اسکی یادِ عشرتِ پیہم مرے لئے
۲۴ اگست ۲۷ء

دل ہے کسی کا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
ذرّہ ہے آفتابِ تجلّی لئے ہوئے

نامِ خدا ادھر بھی نظر ہو کہ ساقیا!
بیٹھے ہیں ہم بھی دل میں تمنا لئے ہوئے

پھر آرہا ہے جھوم کے مستِ شبابِ حسن
آنکھوں میں موجِ قلزمِ صہبا لئے ہوئے

پھر آگئی بہارِ گل افشان و مے فشاں
دامن میں صد ہزار تماشا لئے ہوئے

معمور کائنات ہے تیرے جمال سے
ہر شے ہے تیرے حسن کا جلوا لئے ہوئے

پہنائے کائنات ہے فردوسِ رنگ و بو
ہر شے ہے جلوۂ طرب افزا لئے ہوئے

لیلائے شب ہے سازِ محبت پہ نغمہ زن
حورِ سحر ہے دوش پہ مینا لئے ہوئے

ہر آستانِ حسن پہ جھک جھک گئی جبیں
سر میں ہوں بیقراریٔ سجدا لئے ہوئے

ہے چودھویں کا چاند کہ سر چشمۂ سرور
آغوش میں جمال کی دنیا لئے ہوئے

کیوں روحِ جذب ہو گئی حسنِ مجاز میں؟
یارب ہیں جلوہائے تماں کیا لئے ہوئے!

خورشید و ماہتاب ہیں، یا ساقی بہار
میرے لئے ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

ہر گل کو چومتا ہوں اثرؔ فرطِ شوق سے
ہر گل ہے انکا جلوۂ زیبا لئے ہوئے
۱۳ راگست ۲۶ء

مجھ پہ کب چشمِ خشمگیں نہ ہوئی !
کب مری زندگی حزیں نہ ہوئی !

زندگی سوز ہے، کہ تا دمِ زیست
ختم یہ آہِ آتشیں نہ ہوئی ،

ٹوٹ کر دل میں رہ گئے آنسو
محرمِ حالِ آستیں نہ ہوئی ،

خوگرِ تلخئ محبت کو ،
ہوسِ جامِ انگبیں نہ ہوئی ،

آستانے نگاہ سے گذرے
مائلِ بندگی جبیں نہ ہوئی ،

لاکھ جلوے بسے نگاہوں میں ،
کوئی تصویر دلنشیں نہ ہوئی ،

کعبہ و دیر و میکدے میں رہے
دل کی تسکیں مگر کہیں نہ ہوئی ،

مستی کوثر و بہشت اثرؔ
کبھی شرمندۂ یقیں نہ ہوئی
یکم جنوری ۳۱ء

گو تو نہیں ملا ہے، تری جستجو تو ہے
ناکام آرزو ہی سہی، آرزو تو ہے

یہ ناشناس دست و گریباں ہوئے ہیں کیوں
دیر و حرم میں جلوہ نما تو ہی تو تو ہے

اچھا ہے میں اسیر فریب بہار ہوں
یہ رنگ و بو فریب سہی، رنگ و بو تو ہے

جانے اب اسمیں کس کی تمنا جلوہ ریز ہے!
آئینۂ خیال مرے روبرو تو ہے

گو تجھ کو جانتے نہیں، پہچانتے نہیں
دیر و حرم کے لب پہ تری گفتگو تو ہے

بے کیف زندگی سے ہے بہتر جنون عشق
یہ بادہ تلخ تر ہی سہی، ہاؤ ہو تو ہے، ۵ مارچ ۲۸ء

ہر شے پہ طاری ہے کیف مستی
نغموں سے رقصاں ہے ساز ہستی

مینائے دل ہے رشک خمستاں
ہوں بے نیاز ساغر پرستی،

رنگیں نوائی، نغموں کی دنیا
بزم تصور، جلووں کی بستی،

طوبیٰ سے بالا، میری بلندی
ہمپایۂ عرش ہے میری پستی

ہے رائگاں شکوۂ نارسائی
کمبخت! تیری کوتاہ دستی!!

آغاز و انجام اس کے کنارے — ہے موجزن جاوداں بحرِ ہستی
کیف آفریں ہے یادِ جوانی، — رسوائی و رندی و بت پرستی

صہبائیؔ نہ مست و مدہوش ابھی تک!
کب کی ہوئیں ختم شبہائے مستی!!

۳۰ نومبر ۱۹۳۰ء

اب خواب ہے آہ دورِ جوانی، — شامِ طرب کی رنگیں کہانی،
ہر نقش میں جلوۂ دلربائی، — ہر ساز میں نغمۂ شادمانی
وہ چاندنی رات کی بزمِ رنگیں — گلفام ساقی، مئے ارغوانی
وہ نازنینوں کا رقصِ مستی — مطرب کا وہ نغمۂ جاودانی
وہ دیدۂ شوق کی میگساری، — وہ جلوۂ حسن کی مے فشانی
وہ وصل کی عشرتِ بادہ نوشی — وہ ہجر کی لذتِ خونچکانی!!
وہ حسن اور عشق کی داستانیں — کچھ گلفشانی، کچھ خونفشانی
پُرکیف و رنگیں تھی بزمِ ہستی — تھا رشکِ فردوس عہدِ جوانی،

ہر چند وہ محفلیں مٹ چکی ہیں
یاد ان کی لیکن ہے غیر فانی

۶ر دسمبر سنہ ۳۰ء

وہ اسرارِ مصافِ زندگانی کو کہاں سمجھے!
جو ناداں ہر بلا کو اک بلائے آسماں سمجھے

نہیں تقدیر کچھ بھی، تو ہی سرِّ کامرانی ہے
مگر اس راز کو سمجھے تو کوئی کامراں سمجھے

نہ پوچھو تلخیٔ جامِ محبت آہ! مت پوچھو
ہی نامہرباں نکلے جنہیں ہم مہرباں سمجھے

رہے محرومِ لطفِ شادمانیہائے منزل سے
وہ رہرو جو فرازِ راہ کو کوہِ گراں سمجھے

ترا ہر نقشِ پا ہے سجدہ گاہِ عالمِ امکاں!
اگر اپنی حقیقت اے رہینِ آستاں سمجھے!

نہ پایاں ہی ملا اس کی نہ ساحل ہی نظر آیا
آثؔر ہم زندگی کو ایک بحرِ بیکراں سمجھے

۲۰ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء

اے دوست گو تری نگہِ خشمگیں رہی! پھر بھی نثار تجھ پہ ہی جانِ حزیں رہی!!

سرگرمِ کار ناخنِ تدبیر بھی رہا تقدیر کی گرہ بھی جہاں تھی وہیں رہی

رسوائے دہر ننگِ جہاں ہی سہی، مگر سجدوں سے بے نیاز تو اپنی جبیں رہی

بزمِ طرب لئے ہوئے آتی رہی بہار لیکن نوائے سازِ دل اندوہگیں رہی

اِک دورِ سرخوشی تھا بہارِ شباب میں مینائے دل میں موجِ مئے آتشیں رہی

غمہائے دہر میں بھی رہی لذتِ نشاط پیشِ نظر تری نگہِ اولیں رہی

رقصاں رہے ہیں عالمِ مستی میں اہلِ شوق ہر موجِ حسن بادۂ کیف آفریں رہی

مجبورِ التجا نہ کبھی چشمِ تر ہوئی اشکوں کے پونچھنے کو مری آستیں رہی

ہر گام پہ تھا خندۂ تقدیر اے آثؔر
ہر چند چشمِ عقل بہت دور بیں رہی

۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

سمن زار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سمن زار

کسی کے خیال میں

(۱)

عرصۂ عالم پہ خاموشی سی چھا جاتی ہے جب
اور سو جاتا ہے مغرب کی لحد میں آفتاب

منہ چھپا لیتا ہے تاریکی کے پردوں میں جہاں
اور پہن لیتی ہے دنیا ظلمتِ غم کی نقاب

(۲)

اس سکوتِ شام اس خاموشیٔ پرکیف میں
یاد آ آ کے تری کرتی ہے دل کو بیقرار

تھام لیتا ہوں جگر کو کھینچ کر اک آہِ سرد
یاد پر کرتا ہوں تیری اشک کے گوہر نثار

(۳)

آہ! وہ میری محبت اور وہ تیری سادگی
عشق اپنے حسن اپنے حال میں مستانہ تھا
عشق نوکِ خارِ بیتابی سے تھا نا آشنا
حسن بے پروا ابھی عشق نما سے بیگانہ تھا

(۴)

یہ سرِ پرشور تھا بیگانۂ جوشِ جنوں
اور دلِ وحشی کو شوقِ دشت پیمائی نہ تھا
تو بھی ناواقف تھا احسانِ نگاہِ شوق سے
مائلِ بیگانگی محوِ خود آرائی نہ تھا

(۵)

دل میں پھر ہوتا ہے دریائے محبت موجزن
اور سرورِ دل نشیں کی موجوں میں کھوجاتا ہوں میں
چپکے چپکے یاد پھر کرتا ہوں تجھ کو بار بار
لب پہ تیرا نام ہوتا ہے کہ سو جاتا ہوں میں

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء

صبح وشام

آزاد غم دہر سے ہے چہرۂ خنداں	پرواہی نہیں اسکی گہ گیسوہیں پریشاں
کہتے ہیں کہ ہوتے ہیں حسیں رہزن ایماں	یہ حسن تو ایماں کا ہے سرچشمہ حیواں

کیا سادہ و پر لطف جمال سحری ہے!

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں	ذرات چمن غیرت صد طور ہوئے ہیں
پردے رخ محبوب کیا دور ہوئے ہیں!	اشجار مئے نور سے مخمور ہوئے ہیں

قدرت کی صراحی مئے وحدت سے بھری ہے

شام

ظلمت نے ہے اب ارض وسما کو کیا تسخیر	معمورۂ آفاق بنا درد کی تصویر
طاری ہے سکوں گویا ہر اک چیز ہے دلگیر	خاموشیٔ عالم میں ہے تاثیر سی تاثیر

اس نغمۂ خاموش کی لے درد بھری ہے

جو نیلے سے آکاس پہ روشن ہیں ستارے کس حسن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے!

مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے اللہ ربا، روح فزا ہیں یہ نظارے

کس شاہد محبوب کی یہ جلوہ گری ہے!

ہو نور سحر کا، کہ سیاہی شب غم کی ہو نغمۂ مطرب کہ ہو صحرا کی خموشی

مہتاب فلک پر ہو، کہ ہو ابر میں بجلی جس چیز سے پوچھو، وہ بصد ناز کہے گی

اے پوچھنے والے! یہ تری بے بصری ہے

۵ / اپریل سنہ ۱۹۲۱ء

آرزو

ہر اشک کے دامن میں ہو دریائے محبت ہر ذرہ مرے دل کا ہو صحرائے محبت

ہو پیکر ہستی مرا مینائے محبت خوں میں ہو مرے آتش صہبائے محبت

گردش میں رہے تا بہ ابد جام محبت

ہر ذرۂ دنیا ہو مے آشام محبت

تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

نغمۂ صبح

(۱)

صبح خنداں ہے، موسمِ گل ہے
نغمہ زن اپنی لے میں بلبل ہے
موج زن چار سو تبسم ہے
یہ سماں پیکرِ ترنم ہے
اودے بادل برنگِ سنبل ہیں
گویا حورِ سحر کے کاکل ہیں،
دلربا گیسوئے پریشاں ہیں
ان پہ لاکھوں بناؤ قرباں ہیں،
دامنِ کوہ میں کوئی جوگی،
بیٹھ کر ہے بجا رہا بنسی
سب سے بہتر یہی عبادت ہے
لب پہ اک نغمۂ محبت ہے
نغمۂ سرمدی کی تانیں ہیں،
بزمِ بالا کی داستانیں ہیں
روح لرزاں ہے مثلِ تارِ رباب
جسکو نغمے کی موج ہے مضراب

وجہ تسکیں یہ بیقراری ہے ‏ ‏ نشہ آگیں یہ بیقراری ہے
روح مضطر نہیں ہے رقصاں ہے ‏ ‏ فرطِ نغمہ سے تار لرزاں ہے
عالمِ بےخودی میں جاتا ہوں،
تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

جامِ سُرور

(۲)

شام کا دلفریب منظر ہے ‏ ‏ روح پرور ہے، کیف آور ہے
مشک افشاں ہے تیرگی شب کی ‏ ‏ غرقِ دریائے کیف خاموشی،
ہے خراماں ہوائے عنبر بار، ‏ ‏ ہے فضا رشکِ طبلۂ عطّار
دامنِ آسماں نہیں پُرخوں ‏ ‏ ہے رواں بحرِ بادۂ گلگوں
خوب جی بھر کے پی رہے ہیں سبھی ‏ ‏ چھا رہی ہے ہر ایک پر مستی
میکدہ ہے، کہ بزمِ ہستی ہے! ‏ ‏ ذرّے ذرّے پہ جوشِ مستی ہے

میں بھی جامِ طہور پیتا ہوں　　بادۂ پرسرور پیتا ہوں

عالمِ بے خودی میں جاتا ہوں

تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

پیکرِ نغمہ

(۴)

چاندنی شب، کنارِ دریا ہے،　　ہلکا ہلکا سا ابر چھایا ہے

چاند کی چاندنی رسیلی ہے　　بھینی بھینی ہے، پیاری پیاری ہے

ساغرِ مہ میں ہے شرابِ سرود،　　کہکشاں میں رواں ہے آبِ سرود

فلکِ نیلگوں میں موسیقی　　عالمِ پرسکوں میں موسیقی

کوہ و صحرا میں نغمۂ دلگیر　　موجِ دریا میں نغمۂ دلگیر

یہ ستارے جو ٹمٹماتے ہیں　　رقص کرتے ہیں گیت گاتے ہیں

نغمہ پیرا ربابِ ہستی ہے　　پیکرِ نغمہ ساری بستی ہے

ذکر میں تیرے محو ہے عالم شورِ "ھُو حق" ہے اُٹھ رہا پیہم
راگ تیرا سکوت گاتا ہے مست و بیخود مجھے بناتا ہے

عالمِ بے خودی میں جاتا ہوں
تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں

جون سنہ ۱۹۲۱ء

لطفِ سحر

شورشِ حرص وہوا سے سخت گھبرایا ہوں میں
دور آبادی کے ہنگاموں سے یاں آیا ہوں میں

ہے فضائے دشت و دریا کیف میں ڈوبی ہوئی،
ذرہ ذرہ دہر کا ہے مستِ جامِ بے خودی

سطحِ خاموشی پہ ہیں کچھ کچھ شکن پیدا ہوئے

یعنی مرغانِ سحر ہیں زمزمہ پیرا ہوئے
پھول ہیں جوشِ مسرّت سے چمن میں جھومتے
اور لپٹ کر شوق سے اک دوسرے کو چومتے
گو اداستانِ حسن و عشق کی بیباک ہے
پاک ہیں خود بھی، محبّت بھی سراسر پاک ہے
نغمۂ بادِ سحر لبریزِ پیغامِ سکوں،
گلشنِ عالم کا ہر ذرّہ ہے اک جامِ سکوں
ذرّہ ذرّہ از زمیں تا آسماں سرشار ہے
کیا خمار آگیں نوائے بربطِ کہسار ہے!
کیا سکوں افزا ہے منظر قائمہ کہسار پر،
کیفِ وجدانی ہے طاری چیں کے اشجار پر
زائرانِ جلوہ ہائے حسنِ قدرت کے لئے

میزباں کس شوق سے آغوش ہیں کھولے ہوئے!

ذرہ ذرہ دہر کا قطرہ ہے موج نور کا،

بہہ رہا ہے چار سو دریا ضیائے طور کا

کوہ و صحرا، دشت و دریا کی ادا مستانہ ہے

محفل عالم سراپا محفل میخانہ ہے

۱۵ر جولائی ۱۹۲۲ء

افکار پریشاں

ایک دوست کی موت پر

زندگی کیا ہے! اور قضا کیا ہے!! ابتدا کیا ہے! انتہا کیا ہے!!

یہ فنا کیا ہے! یہ بقا کیا ہے!! یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!!

دل کہ برق و شرار ہوتا ہے

دم میں مشت غبار ہوتا ہے

روح زار و نزار ہوتی ہے
ہجر میں بیقرار ہوتی ہے
وہ اسیرِ غبار ہوتی ہے
اک غریب الدیار ہوتی ہے

جوشِ وحشت اُسے ستاتا ہے
یک سیلِ رواں بناتا ہے

خانۂ دِل کو توڑ دیتی ہے،
پیکرِ گِل کو توڑ دیتی ہے
اپنے محمل کو توڑ دیتی ہے
سب سلاسل کو توڑ دیتی ہے

پھر وہ آزاد ہو کے گاتی ہے
اور فضا میں سمائے جاتی ہے

جا چمکتی ہے وہ ستاروں میں
رقص کرتی ہے لالہ زاروں میں
نغمہ پیرا ہے آبشاروں میں
جلوہ فرما ہے کوہساروں میں

مے کبھی جامِ ماہتاب میں ہے
شوخیٔ حسنِ آفتاب میں ہے

اے دلِ زار! بیقرار نہ ہو!! مائلِ آہ و دلفگار نہ ہو!!

دیدۂ شوق! اشکبار نہ ہو!! عشق ہو، اور وصلِ یار نہ ہو؟

وہ ہمیں میں ہے، وہ جُدا نہ ہُوا

وہ یہیں ہے، کہ وہ فنا نہ ہُوا

خندہ ہائے بہار میں وہ ہے نغمہ ہائے ہزار میں وہ ہے

شبنمِ آبدار میں وہ ہے رقصِ ہر شاخسار میں وہ ہے

آنکھ کے تل میں بس رہا ہے وہ

روح میں دل میں بس رہا ہے وہ

۵؍جون ۱۹۲۳ء

تمکینِ دل

اے جمالِ سحر! کہاں ہے تو! اے گُلِ تازہ تر! کہاں ہے تو!

اے سکونِ جگر! کہاں ہے تو! اے فروغِ نظر! کہاں ہے تو!

چشم ہے تنگ و تار بن تیرے

روح ہے بیقرار بن تیرے

ڈھونڈھتا ہے مجھے کہاں ہوں میں؟ تیرے سینے ہی میں نہاں ہوں میں

ایک دریائے جاوداں ہوں میں مثلِ موجِ صبا رواں ہوں میں

چشمِ دل جب نہ وا کرے کوئی!

"کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی!"

۷ رجون ۱۹۲۳ء

یادِ ایام

پیکرِ حسن بزمِ قدرت ہے　　نغمہ پیرا ربابِ فطرت ہے
ایک مستی سی ہے ہواؤں میں　　اک ترنم سا ہے فضاؤں میں
مستِ صہبائے حسن ہے دنیا　　غرقِ دریائے حسن ہے دنیا
حسن ہے چاند میں، ستاروں میں　　حسن پھولوں میں، حسن خاروں میں
حسن وادی میں، حسن دریا میں　　حسن گلشن میں، حسن صحرا میں
کوہ میں حسن، جوئبار میں حسن　　نغمۂ سازِ آبشار میں حسن

ایک دریائے حسن جاری ہے
روح مصروفِ میگساری ہے

چاندنی میں ہے سحرِ رعنائی　　میں ہوں محوِ خیال آرائی،
وہ زمانہ بھی کیسا زمانہ تھا!　　خوابِ شیریں کا اک فسانہ تھا!

پیار تھا چاند سے، ستاروں سے
سبزہ زاروں سے، کوہساروں سے

نغمۂ آبشار سے الفت،
دامنِ جوئبار سے الفت،

گاہ شیدائے عشقِ پروانہ!،
حسنِ شعلہ کا گاہ دیوانہ!،

جلوہ گاہِ جمال تھی دنیا
ایک رنگیں خیال تھی دنیا

رشکِ فردوس میری ہستی تھی،
پیکرِ بیخودی و مستی تھی!،

حسن بھی، عشقِ ناصبور بھی تھا
طور بھی، برقِ کوہِ طور بھی تھا

وقفِ طغیانیٔ شباب ہوں میں،
ایک گردابِ اضطراب ہوں میں

مستِ پیمانۂ محبت ہوں،
ایک دیوانۂ محبت ہوں،

ایک دل میں ہزار ارماں ہیں،
ایک قطرے میں لاکھ طوفاں ہیں،

غرقِ دریائے حسنِ خوباں ہوں
قیدیٔ گیسوئے پریشاں ہوں

دولتِ حسن کا بھکاری ہوں،
دیرِ ہستی کا اک پجاری ہوں،

سیلِ الفت ہے میرے سینے میں جوشِ صہبا ہے آبگینے میں !،

برقِ بیتاب ہوں، شرار ہوں میں،

مثلِ سیماب بیقرار ہوں میں،

عہدِ طفلی بھی خواب تھا گویا ! ایک رنگیں حباب تھا گویا !

مٹ گیا بحرِ زندگانی میں،

موجِ طغیانیٔ جوانی میں،

۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء

افسردگی

نہ وہ بیقراریاں ہیں، نہ وہ آہ وزاریاں ہیں

نہ وہ گرمیاں ہیں دل میں، نہ وہ شعلہ باریاں ہیں

نہ کسی کی آرزو ہے، نہ وہ سوزِ بیقراری

نہ کسی کی یاد میں ہے وہ ہجوم اشکباری
میں وہ باغ ہوں نہ جس میں ہو بہارِ زندگانی
میں وہ سنگ ہوں نہ جس میں ہو شرارِ زندگانی
نہ وہ شوقِ گفتگو ہے، نہ وہ ذوقِ جستجو ہے!
کوئی آرزو نہ کیجے، یہی دل کی آرزو ہے!

۱۲ نومبر ۱۹۲۳ء

دلِ نامراد

صحنِ چمن کا برگ برگ صفحۂ زرنگار ہے،
خامۂ مانیٔ ازل، باغ کا خارخار ہے
رنگِ ریاضِ کائنات غیرتِ صد بہار ہے
اے دلِ نامراد تو آج بھی بیقرار ہے!

حسن ہے کوہسار میں ، نغمۂ آبشار میں ،
حسن ہے جوئبار میں وادی و سبزہ زار میں ،
حسن ہے پھول پھول میں حسن ہے خار خار میں ،
اے دلِ نامراد تو آج بھی بیقرار ہے!

لالہ و یاسمن میں حسن ، نرگس و نسترن میں حسن
میکدۂ چمن میں حسن ، کوہ و تل و دمن میں حسن ،
نغمۂ خامشی میں حسن شورشِ انجمن میں حسن
اے دلِ نامراد تو آج بھی بیقرار ہے!

بامِ فلک پہ ہو گیا ، ابرِ بہار خیمہ زن ،
مشکِ صبا ختن ختن رشکِ ارم چمن چمن
سازِ طرب ہے نغمہ زن جھوم رہی ہے انجمن ،
اے دلِ نامراد تو آج بھی بیقرار ہے! ۱۲ ؍ نومبر سنہ ۱۹۲۳ء

دُعا

بزمِ ہستی میں، مَیں اک سازِ پریشانی ہوں
سازِ ہستی میں اک آوازِ پریشانی ہوں
مطربِ زمزمہ پردازِ پریشانی ہوں
سینۂ دہر میں اک، رازِ پریشانی ہوں

مضطرب رُوح مری عرصۂ پیکار میں ہے
لمعۂ برقِ طپاں، ابرِ شبِ تار میں ہے

جوشِ وحشت میں کبھی بادیہ پیما ہوں میں
کیفِ حیرت میں کبھی زمزمہ پیرا ہوں میں
محفلِ حسن ہے اور محوِ تماشا ہوں میں
ایک گم گشتۂ صحرائے تمنّا ہوں میں

اک بگولا ہوں کہ آوارہ ہوں صحراؤں میں
صورتِ موجِ پرُ آشوب ہوں دریاؤں میں
ایک دریا ہے اگر دہر تو گرداب ہوں میں
ایک صحرا ہے اگر ماہئ بے آب ہوں میں
برقِ بیتاب ہوں، شعلہ ہوں، کہ سیماب ہوں میں!
ہو گیا کیا مرے اللہ! کہ بیتاب ہوں میں
کیوں نہیں ملتا مرا ساغرِ تسکیں مجھ کو!
کیوں نہیں ملتا مرا گوہرِ رنگیں مجھ کو!
اے کہ حادی ہے ہر اک چیز پہ ہستی تیری!
خار میں حسن ترا، پھول میں مستی تیری!!
عرش کا اوج ترا، فرش کی پستی تیری،
کونسی بستی ہے جس میں نہیں بستی تیری!

اے کہ تو بحر میں ہے، کوہ میں ہے، کاہ میں ہے
شوخیٔ مہر میں، پاکیزگیٔ ماہ میں ہے
غوطہ زن بحرِ عقیدت میں ہے درباں تیرا
ڈھونڈنے آیا ہے یاں سایۂ داماں تیرا
عالمِ وجد میں ہے مرغِ خوش الحاں تیرا
تیرے دربار میں پہنچا ہے ثناخواں تیرا
اپنے الطاف کے پھولوں سے یہ جھولی بھر دے
اشک جو آنکھ سے ٹپکے اسے گوہر کر دے
بادۂ ناب سے معمور ہو ساغر میرا!
ایک خمخانۂ جاوید ہو پیکر میرا!
منسلک سلکِ محبت میں ہو گوہر میرا
صورتِ مہرِ درخشاں ہو مقدر میرا

پھول ہو جاؤں چمن میں کہ صبا ہو جاؤں!
کچھ بھی ہوں تیری محبت میں فنا ہو جاؤں!

ساغرِ دل کو مرے ساغرِ پر نور بنا
بادۂ حسن پلا کر مجھے منصور بنا،

ایک ذرّے کو تجلّی گہ صد طور بنا
میری ہر سانس کو اک نعرۂ منصور بنا

ذرّے کو مہرِ منوّر میں فنا ہونے دے!
قطرے کو موجِ سمندر میں فنا ہونے دے!

یکم دسمبر ۲۳ء

خارِ تجسّس

دلکش کہیں وادی ہے، دلکش کہیں دریا ہے،
دلکش کہیں گلشن ہے، دلکش کہیں صحرا ہے،
آبادی، و ویرانی، کیا خوب تماشا ہے!

ہر ذرے میں پوشیدہ اک حسن کی دنیا ہے
دلکش ہے ہر اک موتا اس حسن کے منڈیں
طوفانِ مسرت ہے الفت کے سمندر میں،

مہتاب کی رعنائی، تاروں کی ضیا باری
کس حسن کا پردہ ہے! یہ پردۂ زنگاری!!!
کیوں روح پہ طاری ہے اک عالم سرشاری!
اوراق پہ فطرت کے کس کی ہے قلمکاری!
دریا ہے، کہ قطرہ ہے، لبریز تجلی ہے
صحرا ہے، کہ ذرّہ ہے، لبریز تجلی ہے

پھولوں کی دل آویزی، بلبل کی غزل خوانی،
ہے محفلِ قدرت میں عشرت کی فراوانی،
لیکن مری قسمت میں ہے سوزشِ پنہانی،

آنکھوں میں ہے حیرانی، دل کو ہے پریشانی،
گلہائے مسرت میں اک خارِ تجسس ہوں
تسکین کی جنت میں پیکارِ تجسس ہوں

۴ر دسمبر ۲۳ء

بزمِ دوشیں

آہ! وہ نازہائے بے انداز! آہ! وہ لطفِ سجدہ ہائے نیاز
آہ! وہ برقہائے حسن و جمال! آہ! وہ شعلہ ہائے قلب گداز
آہ! وہ زمزمہائے روح فزا! آہ! وہ چشمہائے تیر انداز
آہ! وہ بزمہائے چشم فروز آہ! وہ نغمہائے گوش نواز
آہ! وہ شورہائے نوشانوش آہ! وہ بادہ ہائے روح گداز
آہ! وہ لذتِ ہم آغوشی! آہ! وہ لطفِ شکوہ ہائے دراز

آہ! وہ جستجوئے عشرتِ نو! آہ! وہ آرزوئے نو انداز!

آہ! وہ نعرہ ہائے مستانہ!

آہ! وہ ہاد ہوئے دیوانہ!!

۲۰ فروری ۱۹۲۴ء

ناکامِ محبّت

(۱)

او تغافل کیش! اگر یونہی ہیں بے مہریاں ایکدن خاموش پھر میری زباں ہو جائیگی

میری ہستی کیا ہے اک شعلہ زارِ آرزو! ظلمتِ شہرِ خموشاں میں نہاں ہو جائیگی

گو مرا پیکر فنا ہو جائیگا لیکن مری سادگی الفت کی زیبِ داستاں ہو جائیگی

محفلِ ہستی سے محرومِ تمنا جاؤنگا

نقشِ صدقِ عشق کا لیکن بٹھاتا جاؤنگا!

(۲)

شام کو دنیا کے ہنگاموں سے جب گھبرا کے تو
باغ میں پھولوں سے اپنی روح کو بہلائیگی

جب نہ پائیگی کہیں بوئے محبت کا نشاں
جب گلستاں کی کلی ہر ایک مرجھا جائیگی

آہ! پھر اسوقت اے مستِ مئے پندارِ حسن
یاد آ آ کے مری تجھکو بہت تڑپائیگی!

روحِ جنت کیلئے پھر پرفشاں ہو جائیگی
عارضی ہستی تری بھی جاوداں ہو جائیگی

(۳)

ہونگے پھر فردوس کے پھولوں میں دو تو ہم کنار
خوگرِ فتنہ نہیں جس سرزمیں کا آسماں

جسکی ہر آواز میں ہے ربطِ الفت کی گونج
جسکی ہر وادی میں ہیں چشمے محبت کے رواں

پھر وہاں ہونگے تری بہائے لعلیں کے ایاغ
جسکی مستی میں ہے تاثیرِ سرورِ جاوداں

بے نیازِ لطف و جورِ آسماں ہو جاؤنگا
چند جرعے پی کے کیفِ جاوداں ہو جاؤنگا

۲ر دسمبر ۱۹۲۴ء

پی اور پلا ساقی

چھائی ہے گلستاں پر گھنگھور گھٹا ساقی!
دریائے تعطر ہے یا بادِ صبا ساقی!
ہوں جام صبوحی کے رندوں کو عطا ساقی!

پی، اور پلا ساقی
پی، اور پلا ساقی

ہر شاخ ہے مستانہ ہر پھول ہے پیمانہ
ہر مرغِ گلستاں ہے اک مطربِ دیوانہ
یہ محفلِ قدرت ہے یا محفلِ میخانہ!

پی، اور پلا ساقی
پی، اور پلا ساقی

انجام کی کیا کہئیے!! آغاز نہیں معلوم،
ہستی کے مٹنے کا،، کچھ راز نہیں معلوم
کب ٹوٹ کے رہ جائے یہ ساز نہیں معلوم!

پی، اور پلا ساقی

پی، اور پلا ساقی

خمخانۂ فطرت میں، کس حسن کا جلوہ ہے!
صہبائے تبسم کا،! بہتا ہُوا دریا ہے،!
مغموم ہے کیوں ساقی! کس سوچ میں ڈوبا ہے؟

پی، اور پلا ساقی

پی، اور پلا ساقی

۳ ستمبر ۱۹۲۴ء

برسات

ہر شے میں کمال دلبری ہے
ہر نقش میں وصفِ دلکشی ہے

بلبل کی چہک میں جنتِ گوش
پھولوں کی مہک میں عشرتِ ہوش

اک دفترِ حسن ہر کلی میں، !
کیا رنگِ بیاں ہے سادگی میں!

ہے سازِ سکوت کوہ و بن میں،
آہنگِ طرب ہے انجمن میں

ہے جلوۂ حسن آفتاب میں حسن
آئینۂ ماہتاب میں حسن

دل میں ہے مزا، تو رات میں لطف
فطرت کی ہے بات بات میں لطف

ہے پیکرِ حسن بزمِ ہستی
نغمہ ہے بے خودی و مستی

اک حسن کا بحرِ بیکراں ہے
اک عشق کا سازِ جاوداں ہے

اندوہ ربا ہے منظرِ ابر
کیا روح فزا ہے منظرِ ابر!

مستانہ خرام آ رہا ہے گلزار پہ، بن پہ چھا رہا ہے،

میخانہ بدوش ہیں گھٹائیں پیغام سرور ہیں صدائیں

گلہائے چمن کھلے ہوئے ہیں پیمانے سبو بھرے ہوئے ہیں!

اشجار چمن میں جھومتے ہیں میخوار چمن میں گھومتے ہیں

اک رقص ہے محفل چمن میں اک جشن طرب بپا ہے بن میں

اک لطف ہے نغمہائے نے میں اک رنگ ہے جامہائے مے میں!

اک سوز ہے قمریوں کی کو میں اک کیف ہے نعرہائے ہو میں!

باغوں میں ہیں جمع ماہ پارے اللہ! یہ زہد کش نظارے!!

گلرو ہیں خرام ناز میں مست مطرب ہیں سرود ساز میں مست

کچھ رنگ ادا دکھا رہے ہیں! کچھ عشق کا راگ گا رہے ہیں

کیا راگ میں رنگ مل گیا ہے

کیا رنگ میں چنگ مل گیا ہے

اس راحتِ جاں سے دور ہوں مَیں　　مجبور ہوں، ناصبور ہوں مَیں، !

اک محشرِ آرزو بنا ہوں　　وارفتۂ جستجو بنا ہوں،

سوسن میں، سمن میں، نسترن میں　　گلہائے چمن کے پیرہن میں

ہر مطربِ خوش گلو کی لے میں　　ہر بربطِ آبجو کی لے میں، !

ہر رنگ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں　　ہر چنگ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں

وحشت ہے مجھے گل و سمن میں، !

تنہا ہوں ہجومِ انجمن میں !

۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء

چاند اور سمندر

تو ماہِ منوّر ہے　　میں ایک سمندر ہوں

جب تیرا رخِ رنگیں

مخمور بناتا ہے،

میرے دلِ محزوں کو

اندوہ و غم و حرماں

ہو جاتے ہیں سب پنہاں

سیلابِ محبت میں

تو ماہِ منور ہے میں ایک سمندر ہوں

لیکن تری فرقت میں

کچھ اور ہی عالم ہے

ہر داغ مرے دل کا

اک شعلۂ سوزاں ہے

اور سینۂ ویراں میں

اک ہوک سی اٹھتی ہے!

تو ماہِ منوّر ہے میں ایک سمندر ہوں

۲۵ ستمبر ۱۹۲۴ء

حسن

حسن رنگینیٔ گل بھی، خلش خار بھی ہے
نزہت آبادِ محبت بھی، دل آزار بھی ہے

ابرِ تسکیں بھی ہے اور برقِ شرربار بھی ہے
تلخیٔ زہر بھی ہے، بادۂ سرشار بھی ہے

لا دوا درد ہے، یا درد کا درماں! کیا ہے!!
مرگِ ناگاہ ہے یا چشمۂ حیواں! کیا ہے!!

ماہ و انجم میں اگر حسن کا انداز نہ ہو،
بربطِ حورِ سحر زمزمہ پرداز نہ ہو،

پھول میں رنگ نہ ہو، سرو سرافراز نہ ہو
محفلِ دہر اگر جلوہ گہِ ناز نہ ہو،

کور ہو جائے ابھی چشمِ تماشائے جہاں
ظلمت آباد بنے بزمِ دل آرائے جہاں

سازِ ہستی کیلئے صوتِ مضراب ہے حسن
دیدۂ عشق میں رنگینیٔ صد خواب ہے حسن

کشتیٔ ہوش و خرد کیلئے گرداب ہے حسن
خرمنِ دل کیلئے شعلۂ بیتاب ہے حسن

غرق کر دیتا ہے دم بھر میں سفینے لاکھوں
خاک کر دیتا ہے یہ پھونک کے سینے لاکھوں

روح افروز ہے کیا عارضِ زیبائے شباب!
بادۂ حسن سے لبریز ہے مینائے شباب

اک قیامت ہے گر قامتِ رعنائے شباب
برقِ جانسوز ہے یا حسنِ خود آرائے شباب!

حسن شاداب بھی گو عشق کے ہی خون سے ہے
داستاں عشق کی رنگیں اسی مضمون سے ہے

۴ر جنوری ۲۵ء

پلائے جا

بہار ہے، نگار ہے کنارِ جوئبار ہے،
فضائے کوہسار ہے رَبابِ آبشار ہے،
نسیمِ خوشگوار ہے جہانِ زرنگار ہے،
پلائے جا، پلائے جا،
غمِ جہاں مٹائے جا

ستارے ہیں یہ سُو بہ سُو چھلک رہے ہیں یا سبُو!
رواں ہے چاندنی کی جُو ہر ایک شے ہے مشکبُو
یہ بزمِ حسن ہو بہو، ہے اک طلسمِ رنگ و بُو
پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

کبھی بہار کا سماں کبھی ہے منظرِ خزاں،
یہ زندگی کی داستاں عجیب سی ہے چیستاں
رواں ہے ایک کارواں خبر نہیں مگر کہاں!

پلائے جا، پلائے جا،
غمِ جہاں مٹائے جا

کرم ہو ساقیا! کرم نگاہِ مست کی قسم
چلے وہ دورِ جامِ جم، کہ [illegible] جائیں کیف و کم
یہ محفلیں ہیں مغتنم کہ زندگی ہے کوئی دم

پلائے جا، پلائے جا
غمِ جہاں مٹائے جا

۱۶ر جون ۱۹۲۵ء

تاروں بھری رات

وقفِ سکوں ہُوا ہے ہر اک شے کا اضطراب

ہر نقش زندگی کا بنا نقشِ سطحِ آب!

تاریکیوں میں ڈوب گیا جامِ آفتاب

پھونکا شبِ سیاہ نے ایسا فسونِ خواب

سب زندگی کی شورشیں خاموش ہو گئیں

آنکھیں شرابِ خواب سے مدہوش ہو گئیں

عنبر فشاں ہے وادیٔ اخضر میں بوستاں

پیشِ نظر ہے منظرِ فردوس کا سماں،

دامانِ گلفروش ہے دامانِ کہکشاں!

کیا دلفریب چرخ کی ہیں زرنگاریاں،

افشاں جبینِ شب پہ نمودار ہو گئی!
سطحِ فلک تمام سمن زار ہو گئی!
تارے فضائے عرش میں ہیں جگمگا رہے
آویزے یا ہیں ماہ جبینانِ خلد کے!
روشن ہوئے ہیں محفلِ بالا کے قمقمے!
یا ڈل میں پھول ہیں یہ کنول کے کھلے ہوئے!
حورانِ خلد شب کے لئے بے نقاب ہیں!
یا بحرِ نیلگوں کے طلائی حباب ہیں!
گلشن میں طائروں کے ہوئے آشیاں خموش
صحرا میں ہو گئے جرسِ کارواں خموش!
کوہِ گراں خموش ہے، بحرِ رواں خموش!
بزمِ جہاں خموش ہے، کون و مکاں خموش

شاعر کا ساز زمزمہ پرداز ہے مگر،
اُسکا خیال مائل پرواز ہے مگر،
گو چشمۂ حیات نمودِ سراب ہے
گو اپنی زیست صورتِ شکلِ حباب ہے
گو نقش ہر امید کا اک نقش آب ہے
گو ذکرِ ہست و بود فسانہ ہے خواب ہے
لیکن یہ بزم گلکدۂ رنگِ حسن ہے
عالم تمام جلوۂ ارژنگِ حسن ہے
تاروں سے چرخ ہے ورقِ زرنگارِ حسن
گویا کھلی ہوئی ہے فلک پہ بہارِ حسن
ہے بادہ ریز جلوۂ رنگیں عذارِ حسن
جامِ جہاں ہے عالمِ [illegible] حسن،

پی، اور بے ثباتیٔ عالم کو بھول جا
ناکامیوں کی سوزشِ پیہم کو بھول جا

۲۶ر جون ۱۹۲۵ء

پھول اور ستارہ

میں لالۂ صحرا ہوں! تو عرش کا تارا ہے،
چاہوں کہ پہنچ جاؤں،
اُڑ کر تری محفل میں،
پر میری تگ و دو کیا!
کچھ دُور ذرا اُڑ کر!،
پھر خاک پہ گر جاؤں،
گرتے ہی فنا ہو جاؤں۔

مَیں لالۂ صحرا ہوں، تو عرش کا تارا ہے

۲

تو عرش کا تارا ہے مَیں لالۂ صحرا ہوں

تیرے لئے ممکن ہے

تو چاہے تو بن جائے

قطرۂ شبنم کا!

اور صبحِ بہاراں میں

میرے دلِ سوزاں پر!

اک بار برس جائے

تو عرش کا تارا ہے مَیں لالۂ صحرا ہوں!

۶ جون ۱۹۲۶ء

شباب کیف آفریں

عجیب دورِ مست تھا!
ہر ایک مے پرست تھا!

وہ شب کی مے پرستیاں جوانیوں کی مستیاں!
وہ ساقیانِ خوش ادا وہ بادہ ہائے جانفزا،
وہ نعرہ ہائے ہاؤ ہو وہ وردِ "یا سبو! سبو!!"
نہ صرف مے میں لطف تھا ہر ایک شے میں لطف تھا

عجیب دورِ مست تھا!
ہر ایک مے پرست تھا
(۲)
ہر ایک شے پہ حسن تھا
ہر ایک شے تھی کیف زا

وہ زینتیں بہار کی! بہارِ زر نگار کی
کچھ اسقدر نکھار تھا حسین خار خار تھا
وہ مہوشوں کے جمگھٹے ! وہ گلرخوں کے قہقہے !
سرور خیز تھا سماں جہاں تھا رو کشِ جناں

ہر ایک شے پہ حسن تھا
ہر ایک شے تھی کیف زا
مگر ہے[۱۴] کھو گیا کہیں!
شبابِ کیف آفریں

بہارِ گلستاں وہی ! ریاضِ کہکشاں وہی
زمین و آسماں وہی ہے رونقِ جہاں وہی
اسی طرح عیاں ہے حسن شرابِ جاوداں ہے حسن
مگر وہ بے خودی نہیں وہ لطفِ زندگی نہیں

آثار! ہے کھو گیا کہیں!
شباب کیف آفریں

۱۰ رجون سنہ ۱۹۲۶ء

ستارۂ صبح

عجیب کیف سے لبریز ہے طلوعِ سحر
غریقِ نورِ ازل کائنات کا منظر
فضائے ارض و سما میں عجیب مستی ہے!
شرابِ میکدۂ خلد سے برستی ہے
تو ایک کاسۂ زریں ہے اے ستارۂ صبح
فروغِ بادۂ تسکیں ہے اے ستارۂ صبح!
تو جلوہ گاہِ بہارِ جمالِ یزداں ہے
تو بارگاہِ کریم و رحیم و رحماں ہے
یہیں سے صبحِ تجلّی ظہور کرتی ہے
شبِ گناہ کو فردوسِ نور کرتی ہے
یہیں سے لذتِ ایماں نصیب ہوتی ہے!
یہیں سے مستیٔ عرفاں نصیب ہوتی ہے
یہیں سے قلب پہ ہوتی ہے بارشِ انوار
یہیں سے روح بھی ہوتی ہے محرمِ اسرار

یہ حسن روح کو ایک گداز کرتا ہے
خدا سے بندے کو سرگرمِ راز کرتا ہے

اسیرِ ظلمتِ طوفانِ بحرِ عصیاں تھا — رہینِ کفر تھا محرومِ نورِ ایماں تھا
شبابِ توبہ شکن کی طلسم کاری تھی — کہ دل پہ مستیٔ خوابِ گناہ طاری تھی
وہ مستیاں نہیں کہ ہر شے سے برستی تھی — غریقِ بادۂ رنگیں خدا کی ہستی تھی!
شہیدِ خواب کو بیدار کر دیا تو نے — فروغِ مطلعِ انوار کر دیا تو نے!
تو ایک جامِ مسرت ہے اے ستارۂ صبح! — پیامِ روحِ محبت ہے اے ستارۂ صبح
ترے پیام کی تائید کر رہا ہوں میں — وفا کے عہد کی تجدید کر رہا ہوں میں
غریقِ قعرِ مذلت تھا، سربلند ہوں میں — کہ بارگاہِ ازل میں نیاز مند ہوا میں

خوشا نصیب! سحر خیز ہو گیا میں بھی
تجلیات سے لبریز ہو گیا میں بھی

یکم دسمبر ۱۹۲۶ء

خمستانِ بہار

رنگ بن کر چھا گیا دنیا پہ دامانِ بہار　　حسن برساتا ہے اماں گل افشانِ بہار
دشت و صحرا گلکدے ہیں گلکدے رشکِ ارم　　رو کشِ صد کہکشاں ہے انجمستانِ بہار
چاندِ عصمت کا کنول سورج جوانی کا گلاب　　خوشنما دو پھول ہیں زیبِ گریبانِ بہار
کائنات اک اعزازِ خندۂ معصوم ہے　　جلوہ آرائے جہاں ہے حسنِ یزدانِ بہار
کس قدر وجد آفریں ہیں جلوہ ہائے رنگا رنگ　　جو نغمے نغمہ بن گئے ہیں نغمہ سنجانِ بہار
غیرتِ حورانِ جنت، ساقیانِ گلبدن　　بے نیازِ کوثر و تسنیم مستانِ بہار
چاندنی کی مے گلوں کے جام نظریں پر مست　　ہے یہ اک معصوم بزمِ مے پرستانِ بہار
ذرے ذرے سے ہویدا شوخیِ رنگِ جمال　　پتے پتے پر ہے تصویرِ درخشانِ بہار
کعبۂ فطرت بھی اب خمخانۂ عشرت ہوا　　کس قدر ایماں شکن ہے حسنِ عریانِ بہار
غرقِ صہبائے طرب ہے جھومتی ہے کائنات　　کیف گاہِ حسن ہے رنگِ خمستانِ بہار

حسن کی رنگینیاں موجِ شرابِ ارغواں شوق کی پرکیف نظریں میگسارانِ بہار

گلعذارانِ جہاں گل پیرہن گلپوش ہیں آگیا ہے حسن کے دریا میں طوفانِ بہار

جامِ گل صہبائے شبنم، لالہ ساغر بکف کسقدر رنگیں ہیں یہ اشعارِ دیوانِ بہار

چھا گئیں گلزار پر فردوس کی رنگینیاں ہو رہی ہے خلد سے دنیا پہ بارانِ بہار

سنگریزے اب کہاں ساری زمیں گلپوش ہے پھول برساتے ہیں دیوانے پہ طفلانِ بہار

چشمِ نرگس، قامتِ شمشاد، اندامِ سمن ہیں بہارِ گلفروشی گلفروشانِ بہار

تیرے جھلکائے تبسم رشکِ گلہائے چمن میرا دامانِ تمنا رشکِ دامانِ بہار

حسنِ مطرب، نغمہ رنگیں، کنارِ آبِ جو ساقی گلپوش و گل اندام سامانِ بہار

چاندنی راتیں، مے گلرنگ، آغوشِ جمال یہ بہارِ روح ہے روحِ بہارانِ بہار

بادۂ رنگیں سے ہے لبریز مینائے جہاں تو کہاں ہے اے تمنائے روح اے جانِ بہار!

اس نشاط آباد میں بھی ہے وہ محرومِ نشاط!
ساقیا! اب بھی ہے صہبائی پریشانِ بہار

۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

نذرِ بہار

پھر بہار آئی، بیاباں گلستاں ہونے لگے
پھر گلستاں رشکِ رنگِ جناں ہونے لگے
کوہساروں سے صدائے آبشار آنے لگی
لالہ زاروں میں عنادل نغمہ خواں ہونے لگے
محفلِ انجم میں سازِ سرمدی بجنے لگا
محوِ رقصِ بیخودی پھر آسماں ہونے لگے
رشکِ بزمِ فلک صحنِ چمن ہونے لگا
تختہ ہائے گُل حریفِ کہکشاں ہونے لگے
کوہ و صحرا کی فضائیں عطر میں بسنے لگیں
رشکِ تاتار و ختن سب بوستاں ہونے لگے

عارضِ حورِ سحر خلدِ نظر ہونے لگا
گیسوئے لیلائے شب عنبر فشاں ہونے لگے
دامنِ صحرا بھی رنگیں ہے، کہ گلہائے بہار
جلوہ پیرا کارواں در کارواں ہونے لگے
بزمِ ہستی پھر غریقِ بیخودی ہونے لگی
پھر شرابِ حسن کے دریا رواں ہونے لگے
عشق پھر گرنے لگا سجدوں میں پھر گرنے لگا
پھر حسیں دامن کشاں دامن کشاں ہونے لگے
حسن کے مضراب نے چھیڑا ربابِ عاشقی
نغمہ ہائے عاشقی پھر جاوداں ہونے لگے
چومتا پھرتا ہوں پھر گلہائے رنگا رنگ کو
آپ کے جلوے گلوں میں پھر عیاں ہونے لگے

پھر دلِ مہجور سے اک ہوک سی اُٹھنے لگی
داغہائے سینہ پھر آتش فشاں ہونے لگے

اے بہارِ روح! جب تو ہی نہیں آغوش میں
جلوہ ہائے فصلِ گل آزارِ جاں ہونے لگے

پھر دلِ دیوانہ خو وحشت ہی وحشت ہو گیا!
پھر حسیں ہونے لگے جلوہ فشاں ہونے لگے

میکدوں میں آ پڑے سب خانقاہیں چھوڑ کر
محتسب جب بیعتِ پیرِ مغاں ہونے لگے

دورِ ساغر پھر کنارِ آبِ جُو چلنے لگا!
رنگہائے میکشاں پھر ارغواں ہونے لگے

میکشوں پہ رازہائے دو جہاں کھلنے لگے
جلوہ ہائے عالمِ بالا عیاں ہونے لگے

میکشو! ایسی پیو!! اٹھو نہ روزِ حشر بھی!
گم رہو اعمال کا جب امتحاں ہونے لگے

وعدۂ غلمان و حور و کوثر و تسنیم سے
شیخ صاحب وقتِ پیری بدگماں ہونے لگے

دخترِ رز سے ہوگئی شاید ہم آغوشی نصیب!
حضرتِ "صہبائیؔ" پھر رنگیں بیاں ہونے لگے!

۱۰؍ دسمبر ۱۹۲۶ء

کائنات اور انسان

ہے ازل سے موجزن بحرِ روانِ زندگی | بحرِ بے پایاں ہے بحرِ بیکرانِ زندگی!
انجمن آرائے ہستی ہے ظہورِ زندگی! | ہے ضیا پاش دوعالم شمعِ نورِ زندگی
ہے خمستانِ جہاں میں گردشِ جامِ حیات | ذرہ ذرہ ہوگیا رندِ سے آشامِ حیات

پیکرِ ہستی کی ہے رگ رگ میں ہیجانِ حیات
قطرے قطرے میں ہے پنہاں ایک طوفانِ حیات

ایک جو لانگاہِ بحرِ زندگی ہے کائنات
جسکی اک اک موج سے پیدا ہیں لاکھوں حادثات

بلا چارہ ہوا رہے جسکو غمِ منزل نہیں،
سیل بے پروا ہے جو شرمندۂ ساحل نہیں

ابتدائے زندگی اور انتہائے زندگی،
کاش کھلجائے کبھی یہ بھی کہ کیا ہے زندگی،

اس تماشا گاہ میں اک ہستیٔ انساں بھی ہے
جو دلِ آگاہ بھی ہے دیدۂ حیراں بھی ہے

زندگی ہمیں سمائی اور درخشاں ہو گئی
برقِ مضطر تھی مگر شمعِ فروزاں ہو گئی!

سیلِ آوارہ تھا لیکن چشمۂ عرفاں بنا،
علم و عقل و عشق و ایثار سے انساں بنا

آگہی کا ساز، سوزِ زندگی سے مل گیا،
ہوش بھی اک گونہ جوشِ بیخودی سے مل گیا

نغمۂ پرشوق اٹھا شورِ بے ہنگام سے
ہو گئی معمورِ دنیا درد کے پیغام سے

جلوؤں سے پیدا ہو گئی تصویرِ حسن،
جاگ اٹھی روحِ محبت جاگ اٹھی تقدیرِ حسن

صبح کی رنگینیاں معصوم تر ہونے لگیں،
شام کی تاریکیاں مغموم تر ہونے لگیں،

اک متاعِ بے بہا جب ہستیٔ انساں ہوئی
جنگ اسمیں اور عناصر میں وہیں سے چھڑ گئی

کب نہ آئی دشت میں پیکِ اجل بنکر سموم
خون کے پیاسے نہ لائے مچھلیوں کب ہجوم

کوہ آتش ریز ہیں، اور بحر طوفاں خیز ہیں
یورشیں صد ہا د باؤں کی بھی حشر انگیز ہیں

چار سُو گھیرے ہوئے ہے اسکو سامانِ اجل
ہے ابھی زندہ تو دم بھر میں ہو مہمانِ اجل

بہرِ جنگ اسکے آگے ہیں عناصر صف بہ صف
ہے تنِ تنہا مگر بیچارہ انساں اک طرف

ٹوٹ کر خاموش ہو جاتا ہے سازِ آرزو
غرقِ بحرِ یاس ہوتا ہے جہازِ آرزو

لغزشیں کھاتا ہے رہوارِ عمل بے اختیار
راہ گم کردہ ہے تاریکی میں عقلِ ہرزہ کار

"گردشِ تقدیر" اسکی بے بسی کا نام ہے
اور "خدا" انساں کی کم آگہی کا نام ہے

۹ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

محبّت اور موت

محبت بیخودی ہے، سرخوشی ہے، شادمانی ہے،
شکستِ دل میں بھی لطفِ سرورِ جاودانی ہے،
مگر یہ موت بھی گو جسم کو برباد کرتی ہے،
غمِ ہستی کے زنداں سے ہمیں آزاد کرتی ہے،

محبت کی سحر سے محفلِ دل جگمگاتی ہے
اجل کی شام میں لیکن سکوں کی نیند آتی ہے

محبت تلخ بھی، شیریں بھی ہے، گریاں بھی، خنداں بھی،
محبت گلشنِ عشرت بھی ہے، خارِ مغیلاں بھی،
فضائے موت میں لیکن ہے آزادی ہی آزادی
تمناؤں کی ناکامی، نہ قصرِ دل کی بربادی،

محبت ایک ہنگامہ ہے جوشِ زندگانی کا ،
اجل پیغام ہے لیکن سکونِ جاودانی کا ،

محبت کے لئے غمہائے بے پایاں بھی سہتا ہوں
پیامِ موت پر بھی گوش بر آواز رہتا ہوں ،

اسیرانِ محبت کے بھی دن کیسے گذرتے ہیں
قیامت کی کشاکش ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

۲۹ رجون سنہ ۱۹۳۰ء

درسِ عمل

لبریز درد سے ہیں نواہائے زندگی — معمور تلخیوں سے ہے مینائے زندگی
بزمِ سکوں نہیں ہے یہ ہے کارزارِ زیست — بیکارِ زندگی سے ہے ننگِ بہارِ زیست
موجِ حیات کی ہے تڑپ کائنات میں — طوفانِ اضطراب ہے موجِ حیات میں

شادمانی ہی شادمانی تھی ، کیا حقیقت نہ تھی کہانی تھی!
دل کہ تھا حشرگاہِ جوش وخروش شعلۂ صد ہزار در آغوش
آخرِ کار چاک چاک ہوا بجھ گیا ، بجھ کے خاک خاک ہوا
بیقراری نہ آہ وزاری ہے ایک افسردگی سی طاری ہے
کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں ،
گویا صحرا میں لٹ گیا ہوں میں ،

۲۷ ؍ فروری ۱۹۳۱ء

ذوقِ نظارہ

ماہ میں حسن ترا ، مہر میں تنویر تری ، سنگ میں نور ترا ، خاک میں اکسیر تری
کاکلِ سنبلِ پیچاں میں ہے زنجیر تری لوحِ ہر ذرّہ پہ منقوش ہے تصویر تری
اسقدر وادیٔ نظارہ میں کھو جاتا ہوں
خود بھی اک چشمۂ حسن کا ہو جاتا ہوں

جامِ صہبائی

نغمۂ عقیدت

بحضورِ حضرت عمر خیامؒ نیشاپوری

اے نکتہ شناس و نکتہ آرا ! اے روحِ سخنوری سراپا !

اے نغمہ زنِ ربابِ مستی ! اے کاشفِ رازہائے ہستی !

نغمے ہیں ترے فضا میں رقصاں ہے ربطِ کائنات لرزاں

تو شاعرِ بزمِ آسماں ہے اسرارِ ازل کا رازداں ہے

وارفتہ و میگسار شاعر ! تقدیر کے رازدار شاعر !

اک ہوش ہے تیری مستیوں میں اک راز ہے مے پرستیوں میں

کوثر سے بھی پاکباز مستی تسنیم سے بے نیاز مستی ،

اے خسروِ کشورِ معانی! اے مطربِ سازِ جاودانی!!

ہوتا ہے اب اک نغمہ ہا صہبائی ترے نغمہ پیرا

یہ چھیڑ رہا ہے سازِ الفت ہر لفظ ہے نغمۂ عقیدت

شاید یہ سوز و ساز ہو جائے گا

صہبائی بھی سرفراز ہو جائے

سراپا نیاز

"صہبائی"

جامِ صہبائی

(۲)

موسم میں بہار کے گلستاں دیکھا
ہنگامِ جنوں ہم نے بیاباں دیکھا
کس حسن کے جلوے کے ہیں جویا یارب!
ہر ذرّے کو اک دیدۂ حیراں دیکھا

(۳)

میخانۂ حسن ہے چرخِ مینا میرا
پیمانۂ ماہ، آبگینا میرا
صہبائیؔ بے نیاز ساقی ہوں میں
دنیا سے بہت الگ ہے پینا میرا

(۴)

گو بحرِ حوادث کا تلاطم نہ گیا!
بربط سے مرے لطفِ ترنّم نہ گیا
وہ زندہ دلِ دہر ہوں اے صہبائیؔ
مر کر بھی مرے لب سے تبسّم نہ گیا

(۵)

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا
ظاہر ہے کہ ایک روز مرنا ہوگا
لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل
کیا ڈوب کے مجھ کو پھر ابھرنا ہوگا؟

۶

گو سلسلۂ دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کو، برہمن کو، صنم کو چھوڑا
افکار کی قید سے نہ آزاد ہوئے — زنجیرِ خیال نے نہ ہم کو چھوڑا

۷

بے شاہد و چنگ شغلِ مے پینا — انگاروں سے پھونکنا ہے سینا
اک زہر ہے ورنہ بادۂ ناب — پینا تو کسی کے ساتھ پینا

۸

فریاد نما ہوا تکلم میرا — لبریزِ فغاں ہوا ترنم میرا
اک گورِ غریباں مرے لبہائے خموش — اک غنچۂ پژمردہ تبسم میرا

۹

بیکار یہ اندیشۂ فردا ہوگا — خود سامنے آجائیگا جیسا ہوگا
فرصت ہے اگر آج لنڈھا جام پہ جام — ہونا ہے جو کل آشو وہ ہوگا ہوگا

۱۰

ہے تودۂ سنگ یا نگینہ اچھا
ہے زہر کا خم کہ مے کا مینا اچھا!
اندوہ کی عمرِ جاودانی سے آش!
دو روز کا ہنس کھیل کے جینا اچھا

۱۱

مرنا تو میں جانتا ہوں ہو گا ہو گا
مر جانے پہ "پوچھتا ہوں میں" کیا ہو گا؟
آگر تو مجھے یہاں سے جانا ہے ضرور
جا کر بھی وہاں سے کیا پھر آنا ہو گا؟

۱۲

بارانِ سرور ہے تکلّم تیرا
لبریزِ نشاط ہے ترنّم تیرا!
سرشارِ مئے حسن ہے ہستی میری
اک خندۂ جام ہے تبسّم تیرا

۱۳

وہ ابرِ طلسم کار جھوما !
وہ مونسِ میگسار جھوما
برسے گی شراب آسماں سے
وہ میکدۂ بہار جھوما

۱۴

ہر چند ہے شغلِ مے و مینا اچھا　　چھپ چھپ کے ہی پینے سے نہ پینا اچھا
پینا کی روح سے ہے ہستی مستی　　مر مر کے تو جینے سے نہ جینا اچھا

۱۵

سرشارِ طرب نہیں ہے محسود مرا　　تختِ جم و کے نہیں ہے مقصود مرا
وہ دل کہ گذارے خوشی سے غم کو　　معبود مرا وہی ہے معبود مرا

۱۶

ہر چند نہیں ہے جلوہ پیدا تیرا　　ڈھانپا ہوا عقل نے ہے چہرا تیرا
محسوس یہ ہو رہا ہے لیکن یا رب!　　دنیا تیری ہے، میں بھی تیرا تیرا

۱۷

صہبائے نشاط کا بھی مینا ہوگا　　زہرِ غمِ زندگی بھی پینا ہوگا ،
غم سے بھی نشاطِ روح حاصل ہے جسے　　جینا تو اُسی کا جینا ہوگا ،

(۱۸)

نیرنگِ طلسمِ زندگی کو پایا ! آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا،
تسکیں ہے اگر، تو ذکرِ یزداں میں اشؔو سر چشمۂ بیخودی اسی کو پایا،

(۱۹)

بت پرستی میں گرفتار میں کیونکر ہوتا! واعظِ شہر! جو کچھ تجھ میں بھی جوہر ہوتا!
ہم پرستار تو تیری بھی پرستش کرتے تیرا بھی حسنِ ازل گر کوئی پیکر ہوتا

(۲۰)

آشفتۂ جوشِ شوق خاموش ہوا دانندۂ رازِ ہوش، مدہوش ہوا
تاریکیٔ اندوہ سے گھبرا کے اشؔو صہبائیؔ سرمست و بلا نوش ہوا

(۲۱)

ہو جائیگا مشکبار ہو جائیگا، ہو جائیگا زرنگار، ہو جائیگا
مغموم ہے کیوں اشؔو کہ گلزارِ حیات ہو جائیگا، پُربہار ہو جائیگا

۲۲

لذت کشِ جامِ شادمانی ہو جا! بیگانۂ رسمِ نوحہ خوانی ہو جا!
سرمستیٔ عشق جاودانی ہے اثرؔ پی کر مئے عشق جاودانی ہو جا

۲۳

ہر ایک بقدرِ ظرف مے نوش ہوا بہکا کوئی، تو کوئی مدہوش ہوا
کم ظرف ہے وقفِ شکوہ ہائے بیجا اور دُردکشِ ازل ہے خاموش ہوا

۲۴

کیا کیا نہ کیا دہر میں کیا کیا نہ ہوا! یہ قلبِ طپاں مگر شکیبا نہ ہوا!
آخر کو فنا ہوا یہ کہتے کہتے، افسوس! کہ ایسا ہوا، ایسا نہ ہوا!

۲۵

تو اپنے ہی جوہر سے شناسا نہ ہوا ہر گام پہ منّت کشِ بیگانہ ہوا
پوشیدہ ہیں تجھ میں بھی ہزاروں جلوے افسوس! کہ تو گرمِ تماشا نہ ہوا

۲۶

گل تیرا، نہ باغباں، نہ گلشن تیرا
تیرا ہی دلِ زار ہے مامن تیرا
اغیار سے کیوں ہے تجھکو امیدِ وفا
تیرا کوئی دوست ہے نہ دشمن تیرا

۲۷

آزادِ طلسمِ رنگ و بُو ہی نہ ہُوا
نیرنگِ جہاں کا راز جُو ہی نہ ہُوا
دُنیا سے عبث رہی شکایت تجھکو
افسوس! کہ اپنا دوست تو ہی نہ ہُوا

۲۸

ناکامیٔ زندگی سے ڈرنا کیسا ؟
ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیسا !
زندہ ہے اگر تو نغمۂ ہستی گا
یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیسا !

۲۹

اے شعلۂ برق! شمعِ محفل ہو جا!
غارتگرِ تاریکیٔ باطل ہو جا!
دل حاصلِ کشتِ زندگانی ہے اگر
خاشاکِ خرد کو پھونک کر دل ہو جا!

۳۰

رسوا نہ ہوئے کہ دل کو رسوا نہ کیا ہنگامِ شباب ہم نے کیا کیا نہ کیا؟
بے داغ مگر جبیں رہی مثلِ سحر سجدہ نہ کیا کسی کو سجدا نہ کیا!

۳۱

بیتابیٔ جستجو کا حاصل نہ ملا رہرو ہوں، مگر نشانِ منزل نہ ملا
ڈوبی، اچھلی ہے بارہا کشتیٔ دل بحرِ غمِ زندگی کا ساحل نہ ملا!

۳۲

گہہ لطفِ جمال سے ہم آغوش رہا یا پہلوئے دخترِ رزیں مدہوش رہا
جب کھل گئی آنکھ صبحِ پیری تھی عیاں خاموش، مثالِ شمعِ خاموش رہا!

۳۳

باقی نہیں کچھ بھی داغِ حسرت کے سوا کیا حاصلِ زیست ہے خجالت کے سوا!
اٹھ اٹھ کے فرو ہوئے ہزاروں طوفاں اب کچھ نہیں گریۂ ندامت کے سوا،

۱

ہنگامۂ خواب ہے حقیقت دمِ خواب — کھل جائے اگر آنکھ تو ہے نقش بر آب
یہ سلسلۂ فریبِ ہستی کیا ہے ! — کیا چیز ہے موجِ آب اک شے ہے سراب!

۲

ہنگامۂ معصیت ہی ہنگامِ شباب — پیری میں ہے آہِ سرد اور چشمِ پُر آب
ہے خواب ہی خواب میں یہ ساری تگ و دو — آغاز بھی خواب اور انجام بھی خواب

۱

ہے جام بدست ساقیٔ حور سرشت — اب شوقِ حرم کہاں! کہاں شوقِ کنشت
پیتا ہوں، ببانگِ کوس پیتا ہوں اثرؔ — پروائے جہنم ہے، نہ پروائے بہشت

۲

معمورِ نشاط بھی ہے میخانۂ زیست — آلودۂ زہر بھی ہے پیمانۂ زیست
تاریکیٔ شامِ غم بھی بڑھتی ہی گئی! — رنگین بھی بہت رہا یہ افسانۂ زیست

۳

اے غرقِ گناہ! اے پشیمانِ حیات! ہے یاس سے چاک چاک دامانِ حیات!
جی کھول کے بختِ بد پہ رو لے، رو لے! ہے گریۂ معصیت میں سامانِ حیات

۱

ہے رفعتِ عرش جب ہمارا مقصود کیونکر نہ رہیں مائلِ پروازِ صعود، !
تو حسن میں لاجواب، میں عشق میں فرد تو میرا ہے، اور میں ہوں تیرا معبود!

۲

حورانِ بہشت کی تمنا بے سود! ہنگامِ شباب زہد و تقوے بے سود!
لبریزِ نشاط ہے خمستانِ بہار یادِ غمِ دوش و فکرِ فردا بے سود

۳

اے عجزِ خودی! ہے کیوں سرِ سجود؟ تیرے ہی خیالات ہیں تیرے معبود!!
تیری ہی تگ و دو سے ہے ہنگامۂ دہر ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود

۱

ہے گہر آبادِ آغوشِ صدف — دامنِ گُل میں ہے شبنم اشکبار

ہیں ہوس کارانِ دنیا شادکام — چشمِ شاعر میں ہے اشکِ بیقرار

۲

یا سوئے فلک جرأتِ پرواز نہ کر! — یا شکوۂ جورِ چرخِ کجباز نہ کر ، !!

یا دعویٰ عاشقی کو باطل ٹھہرا! — یا بارشِ سنگ پر بھی آواز نہ کر!!

۳

ہنگامہ بدوش ہیں اداہائے بہار — غمخانۂ حسن رُبائے زیبائے بہار

اس جانِ بہار کی ہے آنکھوں کو تلاش — اے وائے قرار و صبر! اے دل سنبھل!!

۴

فردوسِ نظر فروز ہے سامانِ بہار — اک پیکرِ رنگ و بو ہے سلطانِ بہار

سرشارِ جمال ہے جہاں کی ہر شے — یعنی ہے قدح نوشِ خمستانِ بہار

۵

ہیں میرے تبسم سے ضیاہائے بہار
ہیں میرے ترنّم سے نواہائے ہزار
ہے میری ہی ذات سے وجودِ ہستی
ہے میرے ہی دم سے گردشِ لیل و نہار

۶

فردوسِ بریں ریاضِ عشرت کا غبار
آتشکدۂ غم کا جہنم ہے شرار
اک خوابِ پُر آشوب ہے اندوہِ جہاں
اک رنگِ خیال ہے خمستانِ بہار

۷

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر
اے ننگِ جہاں روح کو برباد نہ کر!
ہمت سے ہے رزمگاہِ ہستی میں وقار
کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر!!

۸

غافل! اسے رسوا سرِ بازار نہ کر!
دوشیزۂ روح کو گنہگار نہ کر!!
مقصود ہے امتحانِ ہمت تیرا
بے یاری و بیکسی کا اظہار نہ کر!

۱

پنہائے جہاں میں خوب کی ہے تگ و تاز — دیکھے ہیں ہزارہا نشیب اور فراز
تقلید کے دام میں تھا ہر ایک اسیر — پائی نہ کسی دل میں ہوائے پرواز

۲

ہائے کیا شے ہے بادۂ گلریز! — روح سرمست، چشم بینا تیز،
مے ہر اک درد کی دوا ہے اشو! — غم ربا، جانفزا، نشاط انگیز

۳

ہے جادۂ زندگی بھی پُرپیچ و دراز — جس میں ہیں ہزارہا نشیب اور فراز
بے دم ہے وہی جسکو تلاش ہمدم — منزل پہ ہے، تھا جو آپ اپنا دمساز

۱

مسرور طیور، پھول مدہوش — شاداب نگاہ، بہرہ ور گوش
چھائی ہوئی مستیاں ہیں ہر سو! — ہر چیز بہار میں ہے مینوش

۱

کبتک نہ سنوگے آہ و زاری کبتک! کبتک نہ کروگے غمگساری کبتک!

آتا ہے پیامبر، نہ آتی ہے اجل کبتک یہ رہیگی بیقراری کبتک!

۲

مسجد میں رہیں سجہ خوانی کبتک! اندیشۂ رزم زندگانی کبتک!!

زندہ ہے تو کارزارِ ہستی میں نکل یہ فکرِ شکست و کامرانی کبتک!

۱

حسن مطرب ہے اور نغمۂ چنگ تختۂ گل ہے اور مئے گلرنگ

الفراق! اے خیالِ جلوۂ حور! والسلام! اے ہوائے عزت و ننگ

۲

عقل حیرانیٔ نگاہ سے تنگ، عشق آماجگاہِ بارشِ سنگ

روح فرسا ہے عقل و عشق کی جنگ ساقیا! ساغرِ مئے گلرنگ!!

۳

دلِ عالم میں ہے خوشی کی ترنگ ساقیٔ خوبرو و خوش آہنگ!
دورِ ساغر ہو، اور نغمۂ چنگ ہیں فریبِ نظر بہار کے رنگ

۴

ذرّوں میں ہے آفتاب کا رنگ قطروں میں درِ خوش آب کا رنگ
ہر برگ پہ زرنگاریٔ حسن، ہر پھول پہ ہے شباب کا رنگ

۱

کیوں شکوۂ روزگار اے دل اے دل!! کیوں گریۂ زار زار اے دل اے دل!!
اس باغ کا خار خار اے دل اے دل!! ہو جائیگا پُر بہار اے دل اے دل!!

۲

دل مشعلِ طور ہے، میں پروانۂ دل دل پیکرِ نور ہے، میں دیوانۂ دل!
شاعر تو نہیں ہوں، اہلِ دل ہوں لیکن؛ لکھتا ہوں جگر کے خوں سے افسانۂ دل

۳

اے کاش! فروغِ نور ہو جائے دل! تاریک ہے برقِ طور ہو جائے دل!
یا حسنِ لمیزل کا آئینہ ہو جائے یا ٹوٹ کے چور چور ہو جائے دل!

۱

گو ماتم و عیش ہیں جہاں میں توام نکتہ یہ عجیب ہے مگر اے ہمدم!
روتا ہے، تو رو رہا ہے تو ہی تنہا ہنستا ہے، تو ہنس رہا ہے سارا عالم

۲

تدبیرِ خرد کی کامرانی معلوم! تاثیرِ بکا و نوحہ خوانی معلوم!
ہنگامِ بہار رقصِ مستی ہو اثر! انجامِ بہارِ زندگانی معلوم!

۱

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں میرے لب پر مگر "نہیں" بھی نہیں
دیکھتا ہوں، تو ہر جگہ موجود، سوچتا ہوں، تو پھر کہیں بھی نہیں

(۲)

ہر لمحہ رہینِ مے پرستی ہوں مَیں ! جس کا نہ خمار ہو وہ مستی ہوں مَیں
مینوشِ جمالِ جاوداں ہوں، یعنی صہبائے خمخانۂ ہستی ہوں مَیں،

(۳)

کیا گلشنِ عالم میں صبا ہو جاؤں ! یا تہ میں سمندر کی فنا ہو جاؤں !
ہستی سے بھی وحشت ہے عدم سے بھی گریز ! حیران ہوں یارب کہ میں کیا ہو جاؤں !

(۴)

سمجھا ہے کوئی مجھکو کہ فرزانہ ہوں کہتا ہے کوئی میکش و مستانہ ہوں،
معلوم نہیں کیا ہوں ! مگر یہ ہے ضرور آزاد ہوں، بیباک ہوں، دیوانہ ہوں

(۵)

گلزار کا پھول پھول پیمانۂ حسن اشجار کی شاخ شاخ مستانۂ حسن
دوشیزۂ صبح ہے صبوحی بر دوش ہنگامۂ سحر چمن ہے میخانۂ حسن !

(۶)

دنیا کی نظر میں کیوں معمّا ہوں میں! کیوں دہر کی محفلوں میں تنہا ہوں میں!
کیوں اہلِ فلک سے ہے محبت مجھکو! کس عرش کا ٹوٹا ہوا تارا ہوں میں!!

(۷)

ہنگامِ شباب غرقِ عصیاں ہوں میں پیری میں رہینِ ذکرِ یزداں ہوں میں
ہیں سلسلۂ زیست کی یہی دو کڑیاں، سرکش ہوں کبھی، کبھی پشیماں ہوں میں

(۸)

فردوسِ خیال کا گلِ تر ہوں میں! صہبائے سخن کا ایک ساغر ہوں میں
اک گوہرِ بے بہا ہے ہر شعر مرا، وہ بحرِ معانی کا شناور ہوں میں!

(۹)

کیا روح فروز ہے ضیا باریٔ حسن! طاری ہے ہر اک دل پہ فسوں کاریٔ حسن
ہے بارگہِ حسن اگر سجدہ طلب! ہے مقصدِ زیست بھی پرستاریٔ حسن

۱۰

میں کعبہ نشیں نہیں ہوں مستانہ ہوں — پابندِ خرد نہیں ہوں، دیوانہ ہوں،
ہو جاؤں گا تیری شمعِ الفت پہ نثار — میں کوئی مگس نہیں ہوں، پروانہ ہوں

۱۱

یا غرقِ شرابِ شادمانی ہوں میں! — یا وقفِ بلائے ناگہانی ہوں میں!
سرشارِ طرب ہوں، یا رہینِ غمِ دہر! — انجام مرا فنا ہے، فانی ہوں میں!

۱۲

مینوشِ خمستانِ جوانی ہوں میں، — سرمستِ سرورِ جاودانی ہوں میں
اوروں کیلئے تو شادمانی ہے شباب — واللہ! شبابِ شادمانی ہوں میں

۱۳

یا حسنِ طرب زا کا تماشا نہ کروں! — یا قلبِ پریشاں کو شکیبا نہ کروں!
ہوں وقفِ طلسمِ درد و لذتِ شب و روز — حیراں ہوں آخر کہ کیا کروں! کیا نہ کروں!

۱۴

ہنگامِ سحر نسیم رقصاں رقصاں کہسار و چمن کے پھول خنداں خنداں
ہو شغلِ مے و چنگ خدارا مطرب! دل رات کی یاد سے ہے لرزاں لرزاں

۱۵

غرقابِ سکوت ہوں کہ تقریر کروں ممکن نہیں سرتابیٔ تقدیر کروں
تدبیر بھی کرنے پہ ہوں مجبور آثمؔ! تقدیر میں لکھّا ہے کہ تدبیر کروں

۱۶

ہر چند تنک تاب ہوں تنہا ہوں میں تاریکیٔ دہر میں اُجالا ہوں میں!!
پوشیدہ ہے آفتابِ رخشاں جس میں وہ صبحِ بہار کا ستارا ہوں میں!

۱۷

آئی ہے بہار گل بداماں! پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں گلشن!
کیا حسن کی شمعیں جل رہی ہیں! ہے محفلِ کائنات روشن!

۱۸

گلپوش ہے شاخسارِ رنگیں، ! یا جلوہ فشاں نگارِ رنگیں !
ہر چیز ہے غرقِ رنگ و بُو میں آئی ہے اثرؔ بہارِ رنگیں

۱۹

پھولوں کے تبسمات کا حسن تاروں کی تجلیات کا حسن
پیغامِ سرورِ جاوداں ہے میخانۂ کائنات کا حسن !

۲۰

تنگ آ کر مجازِ ہستی سے ڈوب جاتے ہیں ہم حقیقت میں
بے خودی کو تلاش کرتے ہیں نغمہ و بادہ و محبت میں !

۲۱

انجامِ تمنا پہ ملامت نہ کریں بیکار ہے مجھے وقفِ ندامت نہ کریں
جو کچھ بھی ہوا، اثرؔ بہت خوب ہوا تقدیر کی احباب شکایت نہ کریں

۲۲

بیہری آسماں سہے جاتا ہوں — دنیا کو طرب نار کہے جاتا ہوں
جلووں کا ہجوم ہے کہ طوفانِ جمال! — میں ہوں کہ سرور میں بہے جاتا ہوں!

۲۳

صہبا کے نشاطِ روح معدوم نہیں — آگاہِ حیات ہیں جو مغموم نہیں،
انجام کی فکر کیوں ہے ناداں تجھ کو! — معلوم نہیں کسی کو معلوم نہیں!!

۲۴

ہنگامۂ عیش و بت پرستی میں نہیں — رندی و سیہ کاری و مستی میں نہیں
معلوم نہیں ہمیں کہاں ہے، کیا ہے؟ — وجدانِ سرورِ بزمِ ہستی میں نہیں،

۲۵

گلہائے سحر کے جام رنگیں رنگیں! — تاروں کی ضیا سے شام رنگیں رنگیں!
کاشانۂ روحِ حسن سے ہے روشن — ہے بزمِ جہاں تمام رنگیں رنگیں!

۲۶

راحت عنقا بلند ایوانوں میں خوشیاں پیدا شکستہ کاشانوں میں
وہ کیف و سرور دورِ ساغر میں کہاں؟ جو وجد کناں ہے تیرے مستانوں میں

۲۷

ساغرِ مئے عیش سے کبھی بھرتا ہوں انجامِ بہار سے کبھی ڈرتا ہوں!
تقدیر ہی یوں تو کارفرما ہے، مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ میں کرتا ہوں

۲۸

آلودۂ غم نشاط ہائے دوراں سوہانِ حیات ہیں ستم ہائے جہاں
ہے تحفۂ فردوس محبت لیکن، ہے اس کی شکست میں بھی لذت پنہاں

۲۹

سرمستِ سرور ہے ہوائے گلشن فردوس نگاہ ہے ادائے گلشن
ہر شاخ ہے مستِ ناز، ہر پھول ہے جام معمورِ نشاط ہے فضائے گلشن

۳۰

صہبائے سکونِ روح ہے تاروں میں ساغر مئے حسن کے ہیں گلزاروں میں
ہے جام و سبو میں اس کی بیسود تلاش ہے کیف انہیں حسین نظاروں میں

۳۱

ہے دیر و حرم میں، اور نہ میخانوں میں مفقود ہے یہ بلند کاشانوں میں،
ہر چند کہیں نہیں ہے تسکیں یا رب! کچھ اس کی جھلک ہے تیری مستانوں میں

۳۲

جب وادیٔ کہکشاں میں کھو جاتا ہوں دنیائے طرب میں جذب ہو جاتا ہوں
کھلتا نہیں کچھ بھی راز جب سوچ کے بعد تھک جاتا ہوں اور تھک کے سو جاتا ہوں

۳۳

تقدیر سے درسِ خامشی لیتا ہوں! ہو جاتا ہوں چپ، لبوں کو سی لیتا ہوں
زہرِ غمِ زندگی ہو، یا جامِ نشاط! جو کچھ بھی ملے، خوشی سے پی لیتا ہوں

۳۴

زندہ تو بہت ہیں، سوزِ مستی ہی نہیں
میکش تو بہت ہیں، جوشِ مستی ہی نہیں
ہے دامِ خرد بہت ہی رنگیں، لیکن
حق بیں تو بہت ہیں، حق پرستی ہی نہیں

۳۵

بیگانۂ عقل و ہوش ہو جاتا ہوں!
طوفانِ یمِ حسرت بدوش ہو جاتا ہوں،
تقدیر کو کوستا ہوں ہنگامِ شکست
جب سوچتا ہوں، خموش ہو جاتا ہوں

۳۶

بیگانۂ ہوش ہوں، کہ ہشیار ہوں میں!
ہوں عالمِ خواب میں، کہ بیدار ہوں میں!
فطرت کی ستم ظریفیاں تو دیکھو!!
"مجبور" کو وہم ہے کہ "مختار" ہوں میں

۳۷

کوئی کہتا ہے کہ محوِ بت ترسا ہوں میں
کوئی سمجھا ہے کہ مرغِ سرِ طوبیٰ ہوں میں
غور کے بعد آخر میں تو یہی سمجھا ہوں
جسکو میں خود بھی نہ سمجھا وہ معمہ ہوں میں

۳۸

سب سے پہلے یہی اک کام کیا کرتے ہیں — صبح اٹھتے ہی ترا نام لیا کرتے ہیں

یاد تو نے بھی کبھی ہم کو کیا ہے پیارے! — نام لے لے کے ترا ہم تو جیا کرتے ہیں

۳۹

دل کو شام و سحر قرار نہیں — موت پر بھی تو اختیار نہیں!

اہلِ دنیا کی محفلوں میں اشکؔ! — کوئی بھی اپنا راز دار نہیں!!

۴۰

ترے پیہم ستم کو اے فلک میں کیا سمجھتا ہوں! — کہ میں ہر نالۂ بلبل کو بھی نغمہ سمجھتا ہوں،

اشکؔ! اب تک مری رنگیں مزاجی کا یہ عالم ہے — کہ موجِ خوں کو بھی رنگینیٔ صہبا سمجھتا ہوں

۴۱

صحرائے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں — ظلماتِ فلک میں برق آباد ہوں میں

جویائے سکونِ جاوداں ہوں! یعنی — ناشاد ہوں، بیتاب ہوں، برباد ہوں میں

(۴۲)

ہر چند کہ آفتابِ رخشاں ہوں میں
گمنامی کے بادلوں میں پنہاں ہوں میں
مستور ہوں دنیا کی نظر سے لیکن
ظلمات میں موجِ آبِ حیواں ہوں میں

(۴۳)

تاراجِ خزاں ہوں، اور رقصاں ہوں میں
گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں !
لذات والم بھی اک معمّا ہیں اشکؔ !
خوش رنج میں، اور خوشی میں گریاں ہوں میں

(۴۴)

دیکھیں تو فقط خاک کا پتلا ہوں میں !
سوچیں تو عجیب ہی معمّا ہوں میں،
ہوتا ہے کبھی کبھی یہ محسوس اشکؔ !
تقدیر کی دسترس سے بالا ہوں میں !

(۴۵)

ہر چند سیہ مست، سیہ کار بھی ہوں !
واعظ بھی ہوں باجبہ و دستار بھی ہوں
کعبے میں بھی ہے نعرۂ تکبیر بلند
میخانہ میں سجدہ گہِ میخوار بھی ہوں !

۴۶

ظلمت آگیں ہے ہجرِ یار کا دن — شبِ تاریک ہے بہار کا دن!

ہجر کی رات ہے پہاڑ کی رات! — حشر کا دن ہے انتظار کا دن!

۴۷

بوالہوس راہِ عشق کیا جانے! — ایک لذت ہے سخت کوشی میں

خود فروشی ہے ننگِ زیست اشوؔ — سرفرازی ہے سرفروشی میں!

۴۸

کیا رنگِ بہارِ جاودانی ہوں میں! — [illegible] قضائے ناگہانی ہوں میں!

معلوم نہیں آخر حقیقت کیا ہے! — ظاہر تو مگر یہی ہے فانی ہوں میں

۴۹

جامِ مے لاؤں کہاں سے لاؤں! — درمانِ غمِ دردِ دل کہاں سے لاؤں!

مانا کہ ہے اضطراب غارتگرِ زیست — یہ بھی تو کہو سکوں کہاں سے لاؤں!

۵۰

ہر رنج میں ہے خوشی کا ساماں پنہاں ہر درد میں ہے درد کا درماں پنہاں،
سہتے رہے رنج و غم بظاہر لیکن ملتی رہی ہم کو داد پنہاں پنہاں

۵۱

ہرچند "سلاسلِ مکافات" بھی ہیں کچھ وجہِ شکست و فتح "حالات" بھی ہیں
تدبیرِ حسنہ بھی، عزم و ہمت بھی درست دنیا میں مگر کچھ "اتفاقات" بھی ہیں !!

۵۲

اک سعیٔ مدام! جسکا حاصل ہی نہیں اک جادہ! کہ روشناسِ منزل ہی نہیں
اک خام خیال ہے تمنائے سکوں اس بحرِ حیات کا تو ساحل ہی نہیں

۵۳

جو لطف ہے جستجو میں، حاصل میں نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظرِ زندگی کہ امواج میں ہے کشتی میں نہیں سکوتِ ساحل میں نہیں

۵۴

مرتا ہوں اگر بادۂ گلفام نہیں پیتا ہوں، تو پیتا بھی خوش انجام نہیں
یہ زیست اک اضطرابِ پیہم ہے اثرؔ حاصل کسی پہلو مجھے آرام نہیں!

۵۵

وہ جلوۂ زرنگار ہستی ہی نہیں! یا ذوقِ نگاہ و بت پرستی ہی نہیں!
جینے کو تو اب بھی جی رہا ہوں لیکن وہ بزمِ طرب، وہ رقصِ مستی ہی نہیں

۱

شان میں عرش کا مکیں ہے تو! خُلق میں بوئے یاسمیں ہے تو!
کیا لکھوں نعت مختصر یہ ہے "خاتمِ دہر کا نگیں ہے تو!!"

۲

گھیرے ہوئے ہے شب کی سیاہی مجھکو رہ رہ کے ڈراتی ہے تباہی مجھکو!
"تابانیٔ آفتابِ امید مگر" دیتی ہے پیامِ صبحگاہی مجھکو!!

۳

ہنگامِ سحر کنارِ جُو ہو، ! بربط ہو، سبُو ہو، مَیں ہوں، تُو ہو!!
ہو جائیں تمام کلفتیں دور دنیا ہی طلسمِ رنگ و بُو ہو!

۴

ہے بزمِ حیات کی نہ پروا مجھکو! ہے ظلمتِ موت کا نہ کھٹکا مجھکو
ہر شام ہے خوابِ مرگ طاری مجھ پہ ہر صبح ہے اِک حیاتِ تازہ مجھکو

۵

سمجھے تھے خوشی کا جام جامِ جم کو، لیکن نہ ملی خوشی یہاں بھی ہم کو،
دیکھا تو فروزاں تھی جبینِ غم میں گو جستجوئے خوشی میں پایا غم کو

۱

ہو جس میں مزا وہ بیقراری اچھی ہو جس سے سکوں وہ اشکباری اچھی
انجامِ فنا ہو جس کا لیکن اے دل! کب ہوتی ہے ایسی آہ و زاری اچھی!

۲

مے حسن کی پیتا ہوں خمخانۂ ہستی سے
سب مجھکو سمجھتے ہیں میکش مری مستی سے
اس مست کو صہبائیؔ ہم مشرب سمجھتے ہیں
حاصل نہ کرے مستی جو بادہ پرستی سے

۳

ہر لطف کے پردے میں ستم پایا ہے
ہر سازِ طرب میں سوزِ غم پایا ہے
میخانۂ دہر میں مئے ناب کہاں!
ہر جام کو آلودۂ سم پایا ہے،

۴

گلزار کا رنگ ہے جوانی میری !
اک نغمۂ چنگ ہے جوانی میری
صہبائیؔ سرمست و بلانوش ہوں میں
نشے کی ترنگ ہے جوانی میری،

۵

ہے زیرِ نقاب شادمانی آئی
کس رنگ میں مرگِ ناگہانی آئی !
تاریکی و نور میں نہ کچھ فرق رہا
آندھی کی طرح اٹھی جوانی آئی !!

۶

تاریک ہیں زندگی کی راہیں ساقی ! ظلمات فزا ہیں میری آہیں ساقی !
ہو جلوۂ آفتابِ پیمانۂ مے ! ہوں نور سے لبریز نگاہیں ساقی !

۷

افسانۂ درد ہے کہانی میری ، عنوان ہے خونابہ فشانی میری
ہوں تیشہ بکف مثالِ فرہاد آتش ! اک کوہِ گراں ہے زندگانی میری

۸

دشوار تریں ہے سب سے مشکل میری مشکل سے مراد ہو گی حاصل میری
دشواریِ رہ بقدرِ ہمت ہے آتش ! خوش ہوں کہ بہت کٹھن ہے منزل میری

۹

تاریکیِ اندوہ ہے باقی ساقی ! ہاں ! بادۂ دلفروز ساقی ! ساقی !!
یہ رنگ یہ محفلیں رہیں یا نہ رہیں ، ہے عہدِ شباب اتفاقی ساقی !

۱۰

گو حسن میں ہیں نقوشِ مانی ساقی ! ہیں بزمِ جہاں کے رنگ فانی ساقی!
ہنگامِ بہار ہو، کہ تاراجِ خزاں خوش باش کہ ہے دورِ جوانی ساقی

۱۱

بیٹھا ہوں دل میں ساغر و مینا لئے ہوئے یعنی تصورِ رُخِ زیبا کئے ہوئے
آنکھوں میں مستیاں ہیں لبوں پر سُرورِ شوق جس طرح میکدے میں ہو کوئی پیئے ہوئے

۱۲

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی ! صہبائے بلائے آسمانی فانی!
یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی! بھر جام، کہ زندگی ہے فانی فانی!

۱۳

گردش میں ہو جامِ تابناک اے ساقی! دامانِ خرد ہے چاک چاک اے ساقی!
سربستہ اسی طرح ہیں اسرارِ جہاں بو نصر[۱] و علی[۲] ہیں مشتِ خاک اے ساقی!

۱. ابو نصر فارابی ۲. بو علی سینا

۱۴

ہے تاک میں مرگِ ناگہانی ساقی! — گردش میں ہو جامِ ارغوانی ساقی!!
جھونکے بطِ مے سے گذر جاؤنگا — نذرِ صہبا ہے زندگانی ساقی!

۱۵

ہنستے ہیں کہ ہے دامنِ گلشن ہستی، — گھلائے ہے برق کاہ ہے خرمنِ ہستی،
آتش کو سمجھ رہے ہیں ہم رنگِ بہار — یعنی ہے خسِ شعلہ بدامن ہستی

۱۶

گو ہستیٔ آتشیں ہے فانی میری! — ہے بزمِ جہاں میں ضوفشانی میری
خود جلنا، مگر جہاں کو روشن کرنا، — ہے صورتِ شمع زندگانی میری!

۱۷

ہے جلوۂ ماہتاب ساقی! ساقی!! — کر جام کو آفتاب ساقی! ساقی!!
سیلابِ فنا ہے، اور ہستی اپنی،، — ہے صورتِ نقشِ آب ساقی! ساقی!!

(۱۸)

آزاد ہوں، زردار نہیں ہوں نہ سہی
سرشار ہوں، ہشیار نہیں ہوں نہ سہی
خمخانۂ عشق کا ہوں اک رندِ خراب
دانندۂ اسرار نہیں ہوں نہ سہی

(۱۹)

کچھ اوج یہ اوج ہے، نہ پستی، پستی،
یعنی ہے عدم، عدم، نہ ہستی ہستی
خمخانۂ حسنِ جاوداں ہے دنیا!
اور گرمیٔ زیست کیف و مستی ہستی

(۲۰)

پیدا و نہاں ہے میری ہستی
اک رازِ عیاں ہے میری ہستی!
ہیں موت و حیات جزر او رمد
اک بحرِ رواں ہے میری ہستی

(۲۱)

ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری
پھر کوئی سنے صدائے مستی میری
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی؟
ہے بےخبری خدا پرستی میری!

۲۲

شوقِ چمن و نگار و مینا ہے مجھے — پیتا ہوں کہ چند روز جینا ہے مجھے
کیوں بادۂ ناب سے نہ سرمست ہوں آج! — کل زہرِ فنا کا جام پینا ہے مجھے

۲۳

ہے رونقِ میخانۂ ہستی اچھی — ہے شام و سحر کی مے پرستی اچھی
لیکن ہے عجیب شے جوانی کی شراب — ہے دونوں جہاں سے اسکی مستی اچھی

۲۴

اک نقطۂ موہوم ہے ہستی میری! — لیکن ہے عجیب چیز مستی میری!
چھوڑا جو خدا تو خود پرستی ہے اٹل! — جاتی ہے کہیں یہ بت پرستی میری!

۲۵

تقویٰ سے بلند بادہ نوشی تیری — راحت سے لذیذ سخت کوشی تیری
آرائشِ ہر عمل تری خود داری! — غارتگرِ زیست خود فروشی تیری

۲۶

کیا رنگِ بہار تیری تدبیر سے ہے! کیا بادِ سموم تیری تقصیر سے ہے!
اندیشۂ انجام میں کیوں گھلتا ہے؟ تقدیر سے ہے تمام تقدیر سے ہے!!

۲۷

ممتاز ہے شانِ ارجمندی میری ہے رشکِ عرش سربلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پہ یا رب! نازاں ہے بہت نیازمندی میری

۲۸

ہے جستجوئے رموزِ ہستی اچھی! اچھی ہے تری خود پرستی اچھی!
سر جس سے وبالِ دوش ہو جائے مگر اس ہوش سے بیخودی و مستی اچھی

۲۹

تختِ جم و کے سے بے نیازی اچھی گنجینۂ زر سے پاکبازی اچھی!
ہنگامۂ بزم و سازِ عشرت سے اثرؔ! ہنگامِ سحر کی نے نوازی اچھی

۳۰

ہے سازِ طرب کی نغمہ باری اچھی ہے بزمِ بتاں کی رنگکاری اچھی
محفل کی مسرتوں سے لیکن اے دل ہنگامِ سحر کی اشکباری اچھی

۳۱

چھایا ہُوا حسن سُو بسُو ہے! ہر پھول میں تیرا رنگ بُو ہے
ہر نقش نگاہِ آشنا میں! تیری تصویر ہُو بہُو ہے

۳۲

جو چاہے وہی ہر ایک انساں ہو جائے ظلمات ہو، یا چشمۂ حیواں ہو جائے
الفت ہے اگر خاک سے ہو جائے خاک یزداں سے اگر عشق ہو یزداں ہو جائے

۳۳

تھی کیف و سرور زندگانی میری فانی تھی مگر وہ شادمانی میری
اندوہِ حیات سے پریشاں ہوں میں بھولا ہوا خواب ہے جوانی میری

۳۴

ہنگامۂ رزمِ زندگانی ہے مجھے
پیکارِ حیات، شادمانی ہے مجھے
وہ ذوقِ ستیز ہے کہ ہر ایک شکست
دیباچۂ فتح و کامرانی ہے مجھے

۳۵

محروم تھا جناب شہرت کے مزے
آلودۂ غم سراب دولت کے مزے
ہر جنتِ محبت بھی ہے فانی لیکن
فردوس نژاد ہیں محبت کے مزے

۳۶

آغاز نشاط کا پریشانی ہے
انجام نشاط کا پشیمانی ہے
جب شادی و غم ہی سے ہے تعمیرِ حیات
پھر غم سے ہراس، کیا ہی نادانی ہے!

۳۷

آئی ہے بہارِ عیش ساماں آئی!
میخانہ بدوش و گل بداماں آئی!
اک کیفِ نشاط ہے جہاں پہ طاری
ساغر کش و بربط زن و رقصاں آئی!

۳۸

پیغامِ طرب ہر ایک منظر ہے مجھے ہر نقشِ جمیل ایک ساغر ہے مجھے

ہے حسن کی مورت اور پجاری ہوں میں پہنائے جہاں حسن کا مندر ہے مجھے

۳۹

ہے بزمِ جہاں، اور حیرت میری ! حیرت ہی مگر ہے مجھکو جنت میری

معلوم کہاں اس کی حقیقت ہوگی ! پوشیدہ ہے جب مجھ سے حقیقت میری

۴۰

مجبورِ فنا نہیں حقیقت میری ! کچھ تجھ سے جدا نہیں حکایت میری

رازِ عدم و وجود کیا ہے یارب ! موجِ یمِ بیکراں ہے حیرت میری

۴۱

خنجر میرا، زباں درازی میری ! گنجینہ مرا ہے، پاکبازی میری

ہر چند گدائے بینوا ہوں، لیکن ہے مایۂ ناز بے نیازی میری

۴۲

صہبائے الست کی ہے مستی میری — خمخانۂ جاوداں ہے ہستی میری!
مجھکو بھی دکھا رہے ہیں اب دار و رسن — ہے میرا بھی جرم حق پرستی میری

۴۳

میکش باقی، نہ بزم ساقی باقی! — ہے داغِ شبابِ اتفاقی باقی!!
فانی ہیں نشاطہائے دوراں یارب! — مستی ترے عشق کی ہے باقی باقی!

۴۴

سرشاریٔ ساغرِ جوانی کیا ہے! — اندوہ و غمِ حیاتِ فانی کیا ہے!
برپا ہے یمِ فنا میں طوفاں یارب! — کیا ہے، یہ شرارِ زندگانی کیا ہے!

۴۵

خود درد کی خو ہے جو درماں نہ ملے — کیا چارہ اگر خوشی کا ساماں نہ ملے؟
ہر چند بتانِ دہر فانی ہیں اشکؔ! — کیا کیجئے؟ جب کہیں بھی یزداں نہ ملے!

(۴۶)

صہبائے نشاط بھی ہے، بزمِ جم بھی
زہرابِ الم بھی ہے، صفِ ماتم بھی،
کچھ اس کا خیال ہے، نہ اس کی پروا
مجبورِ فنا ہے جب خوشی بھی، غم بھی

(۴۷)

مطرب ہے، جو بادہ ہے، ہنگامِ شام ہے
رنگینیٔ شفق ہے، بتِ لالہ فام ہے
منظر نہیں یہ منظرِ خلدِ بریں سے کم
کیا اب بھی اے خدا مجھے پینا حرام ہے؟

(۴۸)

لب پہ کوئی بھی گفتگو نہ رہی، !
دل کو کوئی بھی جستجو نہ رہی، !
کس نے دیکھا ہے مسکرا کے اثرؔ!
کیوں مجھے کوئی آرزو نہ رہی!!

(۴۹)

کیوں ترے نغموں سے اے مطرب!
دل مرا غم میں ڈوب جاتا ہے!
اپنے بربط کو چھیڑتا ہے تو، !
دل مگر میرا تھرتھراتا ہے!

۵۰

کیوں اے دلِ بے صبر یہ نادانی ہے! غمہائے جہاں کے لیے کیوں پریشانی ہے!
کیا دورِ خزاں ہی ہے فنا سے آزاد؟ کیا بزمِ بہار ہی فقط فانی ہے؟

۵۱

چھائی ہوئی مجھ پہ ہے جو غفلت میری ہے تیرے حضور میں عبادت میری
کھل جائے بھرم تیری حقیقت کا وہیں کھل جائے اگر مجھ پہ حقیقت میری!

۵۲

ہنگامۂ بزم سے ہے خلوت اچھی شغلِ مے و چنگ سے ہے وحشت اچھی
شاعر کیلئے یہ اک جنت ہے ہم آشنا ہے صحبتِ نااہل سے عزلت اچھی

۵۳

رشکِ جمِ جم ہے مے پرستی میری وہ مست ہوں جاوداں ہے مستی میری
موجِ مئے ارغواں ہے ہر سانس مری میخانۂ رنگ و بو ہے ہستی میری

(۵۴)

تھی تیرہ و تار روسیاہی میری — اب کیسے کہوں! تھی بیگناہی میری

کچھ دخل ضرور تھا مشیت کا، مگر، — تھی اپنے ہی ہاتھوں سے تباہی میری

(۵۵)

کیوں موت سے کانپتا ہے! کیا کرتا ہے! — کیوں موت کے نام سے اثر قبول کرتا ہے!

اے ننگِ وجود! کیوں ہے ترساں لرزاں! — مرجانے سے پیشتر ہی کیوں مرتا ہے؟

(۵۶)

کیا جوانی بُری ہے اے زاہد! — کیوں تجھے ضد ہے خرقہ پوشی کی!

اہلِ جنت جواں رہینگے مدام! — یہ کرامت ہے بادہ نوشی کی!

(۵۷)

گلزار کا رنگ ہے، کہ ویرانہ ہے! — صہبائے جمال ہی سے مستانہ ہے!

پھیلے ہیں، مہر و ماہ گلہائے بہار — اور محفلِ کائنات میخانہ ہے!!

۵۸

اے کاش! ہر ایک آنکھ مینا ہو جائے! | ہر سینہ فروغِ برقِ سینا ہو جائے!!
لذت کشِ جامِ عشق ہو جائے دل | بیگانۂ ذوقِ جام و مینا ہو جائے!

۵۹

یہ وقت نہیں ہے سرد آہوں کیلئے | کیوں وقف ہو کوئی خانقاہوں کیلئے!
ہنگامِ سحر ہیں جلوہ ہائے ازلی | نظارے عجیب ہیں نگاہوں کیلئے!

۶۰

ساغر مئے حسن کے پلا جاتی ہے | ہر چیز پہ بیخودی سی چھا جاتی ہے
فردوسِ بریں کے پھول کھلتے ہیں اثرؔ | جب صبحِ بہار مسکرا جاتی ہے

۶۱

میخانہ بدوش فصلِ گل آتی ہے | زہرِ غمِ زندگی خزاں لاتی ہے،
گردش ہی پہ ہے مدارِ ہستی کا اثرؔ! | گردش ہی میں زندگی کند جلتی ہے

۶۲

ہے ذوقِ ستیزہ کامرانی ہے یہی ! سرمایۂ لطف و شادمانی ہے یہی
تقدیر کا اُلٹ پلٹنا معلوم ہو گرمِ عمل، کہ زندگانی ہے یہی

۶۳

کیا گردشِ پیہم حیات اچھی ہے! کیا رونقِ بزمِ کائنات اچھی ہے!
دلکو ہو اگر سکوں، تو ہر شے میں ہے لطف دن اچھا ہے، شام اچھی ہے، رات اچھی ہے

۶۴

غیروں سے تجھے امیدِ دلجوئی ہے ! اک عمر خیالِ خام میں کھوئی ہے !
ہر ایک ہے اپنے اپنے غم کا درماں !! درماں جو کسی کے غم کا ہو، کوئی ہے

۶۵

تاریکیٔ شب میں روح گھبراتی ہے ! پیغامِ طرب مگر سحر لاتی ہے !
مستی میں گذر جائے تو کچھ بات بھی ہے یوں سب کی گذر نیکو گذر جاتی ہے

۶۶

جویائے رموز! رمزِ فطرت تو ہے! آگاہِ حقیقت ہو، حقیقت تو ہے!
اسباب و علل میں کیوں ہے غلطاں پیچاں؟ اس عالمِ اسباب کی غائت تو ہے

۶۷

صہبائے نشاط کی تمنا نہ کرے جو تلخیٔ زہرِ غم گوارا نہ کرے!
غم جزوِ حیات ہے، طلبگارِ حیات نیشِ غمِ زندگی کی پروا نہ کرے

۶۸

گذری ہے جگر کے زخم سیتے سیتے زہرابِ الم کے جام پیتے پیتے!
سو بار اگرچہ کوہِ غم بھی ٹوٹے گردن نہ کبھی جھکے گی جیتے جیتے!

۶۹

ہے محفلِ دہر، میرِ محفل تو ہے ہے عزرۂ کائنات، حاصل تو ہے
منزل کی تلاش میں ہے کیوں سرگرداں؟ گم کردہ راہ! اپنی منزل تو ہے!!

۷۰

اک عمر گذر گئی ہے روتے روتے
گردِ غم و اندوہ کو دھوتے دھوتے
تاریکیٔ شامِ غم میں گھرنے والے!
ہو جائیگی دُور یہ بھی ہوتے ہوتے!!

۷۱

دخترِ رز کا ظہور ہو جاتا ہے!
دل نشہ میں چور چور ہو جاتا ہے!
جب برقِ جمال کوندجاتی ہے اثرؔ!
بادل غم کا دُور ہو جاتا ہے!!

۷۲

مدت ہوئی زخمِ دل پہ کھاتے کھاتے
اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے!!
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اثرؔ!
آتا ہے قرار دل کو آتے آتے!

۷۳

غمہائے جہاں کی یاد وا ہو جائے!
یا سجدۂ صبر و شکر ادا ہو جائے!!
غم سے تو نجات بزمِ ہستی میں نہیں
جو غم سے ہراساں ہو فنا ہو جائے

(۷۴)

ہمراہ یہ کارواں لئے جاتا ہے! کیا مجھکو کشاں کشاں لئے جاتا ہے!
اک کشتیٔ آوارہ ہوں، طوفانِ حیات معلوم نہیں کہاں لئے جاتا ہے!!

(۷۵)

شادابیٔ جلوۂ چمن باقی ہے، دورِ قدحِ مئے کہن باقی ہے!
گو بجھ گئیں شمعیں، گو شکستہ ہوئے جام رونق باقی ہے، انجمن باقی ہے

(۷۶)

بیکس ہو اگر تو آہ و زاری نہ کرے طاقت ہو اگر ستم شعاری نہ کرے
غیروں کا تو غمگسار و مونس ہو، مگر اپنوں سے امیدِ غمگساری نہ کرے

(۷۷)

وا خوابِ عدم سے چشمِ مدہوش ہوئی تاریکیٔ شب ہی سے ہم آغوش ہوئی
جب ظلمتِ غم میں کچھ سجھائی نہ دیا! پھر پردۂ نیستی میں روپوش ہوئی

۷۸

غم اسکے لئے ہے اور یہ غم کیلئے
کوئی نہیں مونس ابنِ آدم کیلئے!
ہے زخمِ کرم تو زخمِ دل سے بھی سوا
منت کشِ غیر کیوں ہے مرہم کیلئے

۷۹

عشرت باقی، نہ بزمِ عشرت باقی،
باقی ہے گناہ کی ندامت باقی،
کیا روح فروز ہے مئے حسنِ عمل!
تلخی فانی ہے اور لذت باقی!!

۸۰

بیتاب ہوں جامِ ارغوانی کیلئے!
مرتا ہوں شرابِ شادمانی کے لئے
کوئی نہیں گلگونہ بجز حسنِ عمل
تزئینِ نگارِ زندگانی کے لئے

۸۱

دل ہے اور سوزِ آتشِ غم ہے
چشم ہے، اور اشک پیہم ہے
میری جاں کو خوشی نصیب نہیں
شامِ غم ہے تو صبحِ ماتم ہے

۸۲

فرصت نہ ملی کبھی فغاں سے لاؤں دلِ شادماں کہاں سے!
جب دل ہی تباہ ہو چکا ہے کیا ہوگا شرابِ ارغواں سے؟

۸۳

تعزیرِ گناہ کیا ہے! رحمت کیسی! دوزخ کیا ہے! اور جنت کیسی!
ہے میری ہی ذات میں مکافاتِ عمل ہے شکر کہاں کا! اور شکائت کیسی!

رامش کدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت کدہ

۱ (۲۵-۶-۳۱)

شامِ غم کی ظلمتوں میں اک چمک دیکھا کیے
حسن کے معصوم جلوے دیر تک دیکھا کیے

زخمہائے غم سے سینہ بن گیا ہے لالہ زار
پردہ ہائے زخم میں تیری جھلک دیکھا کیے

۲ (۲۸-۶-۳۱)

لب ہیں ہجومِ نالۂ ماتم لیے ہوئے
آنکھیں ہیں اشکبارئ پیہم لیے ہوئے

رگ رگ میں شعلہ خیز ہوئی آتشِ فراق
بیٹھا ہوا ہوں دل میں ترا غم لیے ہوئے

۳ (")

طوفانِ اضطراب ہے اور رو رہا ہوں میں
شامِ غمِ فراق میں جاں کھو رہا ہوں میں!

ہے سوزِ غم سے شعلہ بداماں خسِ وجود
آغوشِ غم میں تیرے فنا ہو رہا ہوں میں

۴

دل اسقدر گھرا ہوا رنج و الم میں ہے
ہستی میں ہے یہ جسم مگر جاں عدم میں ہے

موجِ فنا ہے اور مری کشتیٔ حیات
طوفانِ اضطراب بپا بحرِ غم میں ہے

۵

صبحِ نمودِ زیست کی تابندگی ہے کیا!
شامِ عدم کی ظلمتِ افسرگی سے ہے کیا!

ہر چند زندگی سے ہی معمور کائنات
لیکن یہ کھل سکا نہ کبھی زندگی ہے کیا!

۶ (۳۰ ۶/۳۱)

ہے شورزار سے گل و ریحاں کی آرزو!
آتشکدہ سے چشمۂ حیواں کی آرزو!

اے مبتلائے دامِ فریبِ نشاطِ زیست!
غمخانۂ جہاں سے ہے درماں کی آرزو؟

۷

شورشِ آبادِ جہاں سے سخت گھبرایا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری تربت پہ کھنچا آیا ہوں میں

رہ گیا ہے آہ! کیا باقی دلِ برباد میں!
چند آنسو چند آہیں نذر کو لایا ہوں میں

۸ — ۲۰۴/۳۶

ہر نظارہ یاس کی تصویر ہے! ہر صدا اک نالۂ دلگیر ہے!
آہِ سوزاں، اشکِ خوں، ناسورِ دل، خوابِ عشرت کی یہی تعبیر ہے

۹ — ״

تیرے جلوؤں سے دلِ نہ اگھرا رہتا ہے تیری ہی یاد میں بیتاب سدا رہتا ہے
گرچہ خشک آنکھیں ہیں، لب بند ہیں لیکن دل میں ایک ہنگامۂ خاموش بپا رہتا ہے!

۱۰ — ״

تیری تربت پہ جب بھی آتا ہوں! دل میں تسکیں کا رنگ پاتا ہوں،
ڈوب کر یادِ عہدِ دوشیں میں رنج و کلفت کو بھول جاتا ہوں!

۱۱ — ۳۱/۳۴

ہے سرحدِ وجود عدم سے ملی ہوئی اب ہمکنارِ موت مری زندگی ہوئی
جینے کو جی رہا ہوں مگر کشتیٔ حیات ٹوٹی ہوئی ہے موجِ فنا میں گھری ہوئی

۱۲ //

میں جب سنسان خاموشی میں تجھکو یاد کرتا ہوں
تری جلوؤں سے اپنی خلوتیں آباد کرتا ہوں
عجب لذت سی ملتی ہے مجھے فریاد و شیون میں
سراپا درد ہو جاتا ہوں اور فریاد کرتا ہوں

۱۳ ۳۱ ۲۰

نوائے سازِ ہست و بود کیا ہے؟
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے
سمجھتے ہو جسے ہنگامۂ زیست!
حقیقت میں یہ طوفانِ بلا ہے

۱۴ //

تاک میں ہے متاعِ ہستی کی
رہزنِ موت لوٹنے کیلئے
ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جانے دے
گوہرِ دل ہے ٹوٹنے کیلئے

۱۵ //

ایک ماتم کدہ ہے بزمِ جہاں
آج مجھ پر یہ آشکار ہوا!
گوشہ گوشہ سے آرہی ہے صدا
"کون ہے جو نہ سوگوار ہوا؟"

۱۶

ساغرِ جم بھی جامِ غم نکلا ! بادۂ عیش میں بھی سم نکلا ! !
زندگی ایک ساز ہے جس سے نالۂ دردِ دمبدم نکلا ! !

۱۷

فصلِ گل ہے یا خزاں کا دن کسکو ہوش ہے! میرے سینے میں بپا طوفانِ غم کا جوش ہے
ایک نغمۂ غمگیں ہے شب کی چاندنی شام کی افسردگی اک نالۂ خاموش ہے

۱۸

آہ تیرے ہجر میں ویران دل ناشاد ہے ایک جذبۂ رشک ہی اک گلشنِ برباد ہے
ہو سکا کوئی نہ اپنا محرمِ دردِ نہاں گریۂ بے اشک ہے اور بے صدا فریاد ہے

۱۹

عمر بھر گرد و غبارِ رنج و غم ڈھویا کئے! اشکباری میں متاعِ زندگی کھویا کئے!
تیرے جلووں سے رہی محروم چشمِ سوگوار! آہ تیرے ہجر میں جب تک جئے رویا کئے!

۲۱

اب کبھی پہلوئے پیکر دل میں خوشی آتی نہیں
مجھکو اپنے حال پر بھی اب ہنسی آتی نہیں
زندگی اک کاہش پیہم ہے تیرے ہجر میں!
درد بھی جاتا نہیں ہے موت بھی آتی نہیں

۲۲

اے مری آنکھیں مری حسرت مری آرام جاں
تیرے ماتم میں مری آنکھیں ہوئی ہیں خونفشاں
اشک گلگوں ہیں مرا عنوان روداد حیات
اور روداد حیات آلام و غم کی داستاں

۲۳

اک عمر کٹی بیخودی و بیخبری میں!
بتخانہ و میخانہ کی دریوزہ گری میں
اب گریۂ پیہم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
ہوتی ہے بسر شام و سحر نوحہ گری میں

۲۴

پینا بھی تو جام غم و اندوہ کا پینا!
یا شام و سحر سینۂ صد چاک کا سینا
بات اک آہ بے اثر کہ یا اک اشک!
اس طرح کے جینے سے تو بہتر ہے نہ جینا!

(۲۴) (//)

بادۂ اندوہ و غم میں ہے خوشی میرے لئے
مخزنِ تسکیں ہے میری بیکلی میرے لئے
رو رہا ہوں خون کے آنسو تمہارے ہجر میں
ایک تحفہ خوں ہوئی ہے زندگی میرے لئے

(۲۵) (//)

اب حسن کے جلوؤں میں بھی وہ رنگ نہیں ہے
اب روح فزا زمزمۂ چنگ نہیں ہے
نیرنگیٔ ہستی ہی دگرگوں نہیں ہمدم!
اب میرے بھی جینے کا کوئی ڈھنگ نہیں ہے!

(۲۶) (//)

ہے چشمۂ حیواں کی طلب تشنہ لبی میں
ہوں ڈھونڈ رہا نورِ سحر تیرہ شبی میں!
اے احسانِ! تو ہی ہے جب سمجھ گئی مجھے
دل کس لئے سرگشتہ ہے ناں طلبی میں!

(۲۷) (//)

رات کا پچھلا پہر تارے ہیں کملائے ہوئے
حسن کے معصوم جلوے چار سو چھائے ہوئے
یہ حوا یہ جل یہ شبنم یہ کیا تیرے طفیل
چشمِ اشک آگیں ہے کیوں اس پہ پھیلائے ہوئے

(۲۸) 〃

کیوں اپنے پرستار سے منہ موڑ گئی ہے! میرے دلِ پُر شوق کو کیوں توڑ گئی ہے!
بیٹھا ہوں تری یاد میں افسردہ و تنہا اے راحتِ جاں! مجھ کو کہاں چھوڑ گئی ہے؟

(۲۹) 〃

یہ پھول کہ اب حسن پہ اترائے ہوئے ہیں کل دیکھنا تم ان کو کہ مرجھائے ہوئے ہیں
انجام سے غافل نہ ہو اے مرغِ نوا ریز! خوشیوں کے یہ سب گیت مرے گائے ہوئے ہیں

(۳۰) 〃

جب بھی ترا ذکر آجاتا ہے رو دیتا ہوں میں ہاتھ سے دامنِ ضبط و صبر کھو دیتا ہوں میں
تا کہ خاموش ہو تا ہے مرا سازِ وجود! آستیں کو اشک پیہم میں ڈبو دیتا ہوں میں

(۳۱) 〃

ہر چیز پہ تاریکیِ غم چھائی ہوئی ہے ہر شے غم و اندوہ سے گھبرائی ہوئی ہے!
ہر نغمہ ہے فریاد ہی فریاد سراپا! آواز مرے ساز کی بھرائی ہوئی ہے

۳۲ — //

وہ دل کہ کبھی جلوہ گہِ حسن رہا ہے
اب آکے اُسے دیکھ ترے ہجر میں کیا ہے!
ہر تار شکستہ ہے مرے بربطِ دل کا
ہر نغمہ مری روح کی پُردرد صدا ہے

۳۳ — //

ہزاروں زخم کھاتا ہوں ہزاروں رنج سہتا ہوں
میں اک فریادِ پیہم ہوں مگر خاموش رہتا ہوں
مری روداد غم ہے بے نیازِ حرفِ گویائی
زبانِ گریۂ خونیں سے اس کا حال کہتا ہوں

۳۴ — //

سنتا ہی نہیں کوئی دعا کیجیے کس سے!
اب عذرِ تسلیم نہ گلہ کیجیے کس سے!
تقدیر بجز نامِ حوادث نہیں کچھ بھی،
کس بات کا شکوہ ہو گلہ کیجیے کس سے!!

۳۵ — //

رنگینیاں جہان کی مستور ہو گئیں
خوشیاں تمام دہر سے کافور ہو گئیں!
تاریکیوں میں ڈوب گئی بزمِ کائنات
آنکھیں ترے فراق میں بے نور ہو گئیں،

۳۶

چھائی ہوئی ہیں اودی گھٹائیں ہیں رقص میں روح پرور ہوائیں !
میں ہوں، تری یاد، اور چشم گریاں سینے میں شعلے ہیں، لب پہ آہیں !

۳۷

تیری تربت پہ رو رہا ہوں میں ، بیج الفت کے بو رہا ہوں میں !
تیرے دم سے تھا شعلہ زار حیات بجھ کے اب راکھ ہو رہا ہوں میں !

۳۸

شب تاریک میں بزم تصور کو سجاتا ہوں سر پر دل پہ اپنی راحت جاں کو بٹھاتا ہوں
رباب شعر لیکر ہاتھ میں جوش محبت سے میں اپنی روح کے خوابیدہ نغموں کو جگاتا ہوں

۳۹

جب آدھی رات کو دنیا سکوں کی نیند سوتی ہے مرا دل تھرتھراتا ہے مری آنکھ روتی ہے
تمہاری یاد آکر چھیڑتی ہے بربط دل کو مرے نغموں میں اک دنیائے غم آباد ہوتی ہے

۴۰ 〃

ترے معصوم جلوے ہیں ابھی میری نگاہوں میں
جبینِ شوق ابھی سجدہ کناں ہے تیری راہوں میں
تری تصویر کا آئینہ اک اشک ہی میرا!
تری الفت کا افسانہ نہاں ہے میری آہوں میں

۴۱ 〃

تری شمعِ محبت شامِ فرقت میں جلاتا ہوں
ترے جلووں سے تنہائی کی راتوں کو بساتا ہوں
بہاتا ہوں تمہاری یاد میں آنسو محبت کے
تمہارے عشق کے نغمے ستاروں کو سناتا ہوں

۴۲

سحر کے روئے رنگیں سے نقاب اٹھائے جاتے ہیں
دلِ محزوں پر لیکن غم کے بادل چھائے جاتے ہیں
تمہارے ہجر میں بادِ صبا اک آہِ غمگیں ہے
نہیں تم جلوہ گر تو پھول بھی مرجھائے جاتے ہیں

۴۳

فضا پر شام کے تاریک پردے پھیل جاتے ہیں
تھکے ماندے پرندے گھونسلوں میں چین پاتے ہیں
نہ جانے مجھ پہ لیکن یہ غم کیا چھائے جاتا ہے!
تڑپ اٹھتا ہے دل آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہیں

(۴۴) (//)
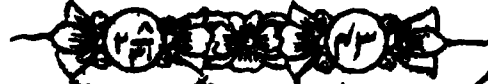
سکوتِ شام میں عہدِ محبت یاد آتا ہے — مرے افسردہ دل پر نور سا اک پھیل جاتا ہے
تری شمعِ محبت کی ضیا باری ہے اے راحتؔ! — شبِ تنہائی کی ظلمت میں بھی دل جگمگاتا ہے

(۴۵) (//)

اے راحتِ جاں! شام کی تنہائی میں اکثر — یاد آتی ہیں کس درجہ تری پیار کی باتیں
تابندگیِ غم ہے ترے جلووں سے درخشاں — اب دل میں اترتی ہیں ستاروں بھری راتیں

(۴۶) (۵۳۱)

شعلہ افشاں میری رگ رگ میں ترا غم ہو گیا — قطرہ قطرہ میرے خوں کا قطرۂ سم ہو گیا!!
لُٹ گیا، مٹ گیا سارا جہاں سنسان ہے — آہ! اب شیرازۂ ہستی ہی برہم ہو گیا!

(۴۷) (//)

تیرے ہی جلوے عیاں ہیں گل کے ہر انداز میں — تیرے ہی نغمے رواں ہیں ہر صدائے ساز میں
تیری ہی تصویر ہے دنیا کا ہر نقشِ جمیل — تیری ہی آواز سنتا ہوں ہر اک آواز میں

۴۸

شام کی افسردہ تنہائی میں گھبراتا ہے دل
یاد کر کر کے تری باتوں کو بھر آتا ہے دل

میرے سینے میں بپا ہوتا ہے اک طوفانِ غم
اور اس طوفانِ غم میں ڈوبتا جاتا ہے دل

۴۹

آوارہ و سرگشتہ و آشفتہ نظر ہوں
درماندہ و افسردہ دل و خستہ جگر ہوں

دامن سے ترے چھوٹ کے کیا حال ہوا ہے
بیچارہ و وحشت زدہ و خاک بسر ہوں

۵۰

تمہاری یاد میں بیٹھا ہوا ہوں شامِ ہجراں میں
دل کے جو سکونِ غم ہوئی قلبِ پریشاں میں

تری صورت دلِ ویراں میں یوں آباد رہتی ہے
کہ جیسے چودھویں کا چاند ہو دشت و بیاباں میں

۵۱

دلِ برباد میں تیرے خیال اس طرح آتے ہیں
شبِ تاریک میں جیسے ستارے جگمگاتے ہیں

ترے جلووں سے شب کی تیرگی معمور ہوتی ہے
ستارے عالمِ مستی میں تیرے گیت گاتے ہیں

(۵۲) — ۹ ۸/۳۱

رات کا گہرا سکوت اک جسمِ بیمارِ نغمہ ہے
چودھویں کے چاند کا نور آبشارِ نغمہ ہے!
نغمہائے شوق سے آتش بجاں رہتا ہوں میں
سازِ دل کا تار تار اک شعلہ زارِ نغمہ ہے!

(۵۳) — ″

گلشنِ رعنائیِ دل میں اب خس و خاشاک ہے
شعلہ زارِ آرزو اب ایک مشتِ خاک ہے
اک جوانِ مست و بے پروا تھا صہبائی مگر
آج تیرے ہجر میں افسردہ و غمناک ہے

(۵۴) — ۱۰ ۸/۳۱

تمہارے غم کے جلوے عیاں ہیں لالہ زاروں میں
تمہارے دلنشیں نغمے رواں ہیں آبشاروں میں
تمہارا روئے رنگیں ماہِ تاباں میں درخشاں ہے
تمہاری مسکراہٹ رقص کرتی ہے ستاروں میں

(۵۵) — ″

ترا حسنِ بہار آگیں گلستانوں پہ چھایا ہے
ترے جلوؤں نے دامانِ بیاباں کو بسایا ہے
ہنسا کرتی ہے جیسے برگِ گل میں بوئے جاں پرور
ترا سوزِ محبت میری رگ رگ میں سمایا ہے

(۵۶) 〃

تو وہ گل تھی کہ مرجھانے پہ بھی ہے مشکبار اب تک
دلِ برباد تیری یاد سے ہے زرنگار اب تک
کنول کے پیرہن میں تیرے جلوے مسکراتے ہیں
لپٹ جاتا ہے پھولوں سے اثرِ بے اختیار اب تک

(۵۷) 〃

آ کے تمہاری یاد پھر چھیڑ گئی بہار میں
آتشِ غم بھڑک اٹھی سینۂ داغدار میں!
ڈوب گیا ہے سوز میں نغمۂ سازِ کائنات!
بجلیاں ہیں بھری ہوئی زمزمۂ ہزار میں

(۵۸) ۱۱ ۸/۳۱

فصلِ گل سرشار و عنبر بیز ہے
منظرِ گیتی نشاط انگیز ہے
میری ہستی ہے سراپا سوزِ غم
نغمۂ دل درد سے لبریز ہے

(۵۹) ۱۳ ۸/۳۱

معمور ہے دامانِ فضا بوئے طرب سے
ہے نغمۂ ہوش رُبا بر لبِ شب سے،
صہبائیِ مہجور تری یاد میں "راحت"!
افسردہ و مغموم ہے بیٹھا ہوا کب سے!

۶۰ — ۱۴ ش ۳۱

اے صبح! ترا جلوۂ اندوہ رُبا ہے — اے شام! ترے نغموں میں اک سحر بھرا ہے!

لیکن دلِ برباد کو کیوں چھیڑ رہی ہو! — خاکسترِ افسردہ میں اب رکھا ہی کیا ہے؟

۶۱ — ״

پُر نغمہائے شوق سے میرا رباب تھا — میں بھی حریمِ نازِ محبت بار یاب تھا

خاکسترِ سیاہ ہے اب تیرے ہجر میں — وہ دل کہ شعلہ زارِ ہزار اضطراب تھا

۶۲ — ״

بزمِ جہاں کی ہر شے دلگیر ہو گئی ہے — میرے سکوتِ غم کی تاثیر ہو گئی ہے

ہر سانس آہِ سوزاں ہر نالہ آتش افشاں — یہ خوابِ عاشقی کی تعبیر ہو گئی ہے

۶۳ — ۱۵ ش ۳۱

تیری تصویرِ جلوہ آرا دل کے غمخانے میں ہے — اک ستارہ ضو فشاں تاریک ویرانے میں ہے

جلوہ گاہِ دہر سُونی ہو گئی تیرے بغیر — ظلمت و افسردگی اب میرے کاشانے میں ہے

۶۴ ۱۷۶۳

فصلِ بہار نغمۂ رنگیں سے مست ہے
گلپوش و گل بدامن و ساغر بدست ہے
اس نغمہ زار و جلوہ کدہ حسن میں مگر،
میرے ربابِ دل کی صدائے شکست ہے

۲۰۶۲۱

یادِ راحت

طرب آگیں ہیں جلوہ ہائے بہار
روح افروز ہیں یہ نقش و نگار!
گلِ صد برگ خندۂ ساقی
موجِ تسنیم نغمہ ہائے ہزار،
صبح پُر نور، عارضِ رنگیں
شامِ تاریک، زلفِ عنبر بار
موجزن ہے یمِ مئے گلگوں،
محفلِ کائنات ہے سرشار
بادہ آگیں نسیم مست خرام!
رشکِ فردوس دامنِ گلزار
موجِ نغمہ ہے کائنات تمام
بزمِ قدرت میں بج رہی ہے ستار

مستئ بوئے گُل جنوں پرور! شوق انگیز روئے گل کا نکھار
ہائے دوشیزۂ بہار کا رنگ! گل بدن، گُل عذار، گُل رخسار

نغمہ و رنگ و بُو کے طوفاں میں

ہے دلِ غم نصیب زار و نزار

اے مری "راحت" بلائے شکیب و قرار! تجھ پہ ہنگامۂ بہار نثار!
تیرے دم سے تھی گُلفشانئ شوق، تیرے غم میں ہے آہِ آتشبار
تو نہیں ہے تو غمکدہ ہے جہاں لالہ و گُل ہیں زخمہائے بہار
سازِ مطرب ہے سوز سے لبریز آتش افشاں ہیں نغمہ ہائے ہزار
آتشِ غم دبی ہوئی تھی، مگر خوب بھڑکا گئی نسیم بہار
تو کہاں چھپ گئی مری "راحت"! روح ہے بیقرار و زار و نزار
اُجڑی اجڑی سی ہے بہارِ چمن غرقِ افسردگی ہیں لیل و نہار

تیرے دامن سے جھٹک کے "صہبائی"
دشتِ وحشت کا ہو گیا ہے غبار

۱۵۳

ہر چند کہ میں خدا نہیں ہوں — لیکن اس سے جدا نہیں ہوں
یزداں ہوں کہ اہرمن سراپا — کھلتا نہیں کیا ہوں، کیا نہیں ہوں!!
سنتا ہوں خوشی کا نام اکثر — اس سے مگر آشنا نہیں ہوں
ہے ایک سراب رنگِ عشرت — اب دھوکے میں مبتلا نہیں ہوں
اب رازِ حیات کھل گیا ہے — شرمندۂ مدعا نہیں ہوں
ہے کشتیٔ زیست وقفِ طوفاں — منت کشِ ناخدا نہیں ہوں
خود اپنی ہی جستجو ہے مجھ کو — آوارۂ ماسوا نہیں ہوں
ہوں رندِ خرابِ بادۂ شوق — میں زاہدو پارسا نہیں ہوں
بے برگ و نوا گدا ہوں لیکن — خوگر کردۂ التجا نہیں ہوں

"صہبائی" بے نیاز ہوں میں
میخانے میں جبہ سا نہیں ہوں

۶۵ — ۲۹/۳۱

ہوئے خاموش آغازِ محبت کے حسیں نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے!
بس اک ٹوٹا ہوا دل یادگارِ عشق باقی ہے
کچھ آنسو ہیں، کچھ آہیں اور کچھ اندوہگیں نغمے

۶۶ — ۳۰/۳۱

کیا کہوں "راحت" تمہارے غم میں کیا ہوتا رہا!
عمر بھر روتا رہا، رو رو کے جاں کھوتا رہا
زندگانی کی شبِ تاریک میں مانندِ شمع،
صبح تک جلتا رہا، گھلتا رہا، روتا رہا!

۶۷ ۶ ۹/۳۱

یہ کیا نسیمِ ولولہ انگیز نہ کر دیا! رنگِ جنوں کو اور بھی کچھ تیز کر دیا

کیا بھر دیا ہے روح میں سوز و گدازِ غم! ❁ کیا سازِ دل کو سوز سے لبریز کر دیا!

۶۸ ۱ ۹/۳۱

اب اک خوابِ پریشاں ہے وہ بزمِ میکشی میری

فضائے دہر پہ چھائی ہوئی ہے بیدلی میری

ہوا خاکسترِ افسردہ اب قلبِ شرر افشاں

بس اک آہِ مسلسل رہ گئی ہے زندگی میری

۶۹ ۶ ۹/۳۱

دل میں اک سوزِ ناتمام رہا آنکھ میں اشکِ لالہ فام رہا

تیرے ملنے کی آرزو نہ گئی عمر بھر یہ خیالِ خام رہا

اے غمِ ہجر! خوب کام کیا !! — دل کا بس کام ہی تمام کیا

یاد تیری ہی دل میں تھی شب و روز — ذکر تیرا ہی صبح و شام کیا،

تیرے کوچہ میں ذرے ذرے کا — ہم نے جھک جھک کے احترام کیا

جان تم پر نثار کر ڈالی — یہی لے دیکے ایک کام کیا

بیعتِ پیرِ میکدہ ہو کر — کعبہ و دیر کو سلام کیا

اے بہار! اے بہارِ عیش و نشاط!! — کبھی ہم کو بھی شاد کام کیا؟

یوں تو بے برگ و بے نوا تھا اشؔ

بے نیازی میں خوب نام کیا

۱۱ ۹/۲۳

اسکے لب پر رہے "نہیں" نہ کہیں! — ٹوٹ جائے دلِ حزیں نہ کہیں!

چارۂ دردِ زندگی نہ ہوا! — اک خلش سی رہی کہیں نہ کہیں،

آشنا ہو کے آستاں سے ترے — پھر کبھی جھک سکی جبیں نہ کہیں

ڈر رہا ہوں کہ اس کی باتوں پر دل کو آجائے پھر یقیں نہ کہیں

اے اثرؔ میرے رخت ہستی کو
پھونک دے آہِ آتشیں نہ کہیں

۱۲۹/۳۱

دل بادہ کش طرب نہیں ہے ہوتا تھا کبھی پر اب نہیں ہے
بے سود ہے جستجوئے راحت وہ راحت جہاں ہی جب نہیں ہے
زخموں سے ہوں چور چور، لیکن آلودۂ شکوہ لب نہیں ہے
خوشیاں تو بہت سی ہیں جہاں میں دل ہی کو مگر طلب نہیں ہے
جل بجھ کے تباہ ہو گیا دل ! افسردگی بے سبب نہیں ہے
کب آہِ سحر نہیں ہے ہمدم ! کب گریۂ نیم شب نہیں ہے !!

جب دیکھو اثرؔ کو رو رہا ہے
مر جائے تو کچھ عجب نہیں ہے

۹/۳۱ ۲۰

کب نالۂ جانستاں نہیں ہے! کب لب پہ مرے فغاں نہیں ہے!!

ہے دودِ سیاہِ آہِ ہستی سر پر مرے آسماں نہیں ہے

اب کس سے کہیں فسانۂ غم ؟ جب کوئی بھی رازداں نہیں ہے

معمورۂ غم ہے بزمِ امکاں ، کوئی بھی تو شادماں نہیں ہے!

وہ دل کہ تھا ایک قصرِ رنگیں، اب اُس کا کہیں نشاں نہیں ہے

آوازِ شکستِ دل ہے ہمدم! اب نغمۂ شادماں نہیں ہے

اب خونِ جگر ہے اور میں ہوں شوقِ مئے ارغواں نہیں ہے

رودادِ اثرؔ ہے اک حقیقت

افسانہ و داستاں نہیں ہے

۲۲ ۹/۳۶

اگر ضو افگن اسمیں جلوۂ جانانہ ہو جائے
طرب زار و نشاط آگیں مرا غمخانہ ہو جائے

بلائیں لے رہی ہے دو جہاں کی عقل و دانائی
خوشا وہ دل! کہ تیرے شوق میں دیوانہ ہو جائے!

صبا! اسکو اٹھا کر دوش پر فردوس پہنچا دے
کہیں ویراں نہ یہ خاکستر پروانہ ہو جائے!

خدا معلوم کیا لذت ہے روداد محبت میں!
کہ جب چھیڑوا سے اک مستقل افسانہ ہو جائے

الٰہی خیر! پھر طوفانِ غم سینے میں برپا ہے
کہیں میرا لبِ خاموش بھی اب وا نہ ہو جائے!

مری آنکھوں سے اشکِ خوں کا اک سیلاب جاری ہے

ترا رازِ محبت بھی کہیں افشا نہ ہو جائے !

سبق آموز ہے تقدیر کی غارتگری ہر دم !

کہ دم بھر میں دلِ عشرت نشاں ویرانہ ہو جائے

دلِ برباد پر سنسان تنہائی برستی ہے

ذرا اس پر نگاہیں ڈال دو، ہیجانہ ہو جائے

وہ میرا کعبۂ عشق و محبّت جلوہ فرما ہے !

نگاہِ شوق! اب اک سجدۂ شکرانہ ہو جائے!!

اُف! اب شکوۂ اغیار کس منہ سے کرے کوئی!

کچھ ایسی آپڑی اپنا بھی جب بیگانہ ہو جائے

۲۵ ۹/۳۱

یہ سلسلۂ حیات کیا ہے! یہ غم کی طویل رات کیا ہے!
آغوشِ فنا میں ہے ہر اک شے یہ محفلِ بے ثبات کیا ہے!
دل بیٹھ نہ جائے بارِ غم سے بیچارے کی کائنات کیا ہے!
ہے چپ سی لگی ہوئی اشؔ کو
معلوم نہیں کہ بات کیا ہے!

۲۷ ۹/۳۱

کیا مرے قلبِ طپاں کو بھی سکوں ہو جائیگا! یا قیامت تک یونہی تڑپیگا اور تڑپائیگا!
کیا نہ ہوگی اب کبھی بھی بارشِ لطف و کرم! اے فلک کیا بجلیاں ہی بجلیاں برسائیگا!
جان ہی لیکر ٹلا آخر یہ آزارِ فراق! چارہ گر کہتے رہے، اب جائیگا اب جائیگا،
دیکھ لی تخریبِ قصرِ آرزو تو دیکھ لی! جانے بختِ بد مگر کیا کچھ ابھی دکھلائیگا!

کیا اثرؔ بھی ہو گیا آوارۂ دشتِ جنوں ؟
وہ تو سمجھاتا تھا سب کو، کون اسے سمجھائیگا!

۱۰
۱۳۶

اب کیا ہوئیں وہ حسن کی رنگیں ادائیاں
چپ ہو گئی ہیں عشق کی جادو نوائیاں

جانے بہ وہ کیا ادا تھی کہ دل میں اتر گئی
میرے لئے ہیں راز تری دلربائیاں

جب تیری بیوفائی پہ بھی تجھ پہ مر مٹے
پھر کیا کہیں کسی سے تری بیوفائیاں!

کیا ہوتا دیکھتے جو کبھی مسکرا کے تم!
محبوب تھیں ہمیں تری بے اعتنائیاں

زندہ ہوں جسکے تذکرۂ جانفزا سے میں
سنتا ہے کس مزے سے وہ میری برائیاں!

آغازِ عشق میں تو ہے دورِ مئے نشاط
انجام کار پڑتی ہیں اس میں جدائیاں

تم ہو خدائے حسن و خدائے ادا و ناز
ہیں جمع ایک ذات میں کتنی خدائیاں!!

دیر و حرم میں سرکش و بیباک ہی رہا
تیرا ہی در تھا جس پہ ہیں جبہ سائیاں

عقل و خرد کو ذوقِ جنوں پر کیا نثار
کیا کیا ہوئی ہیں عشق میں بھی جگ ہنسائیاں!!

تجھ پر اثر نثار دل و جاں بھی کر چکا!
پھر بھی غریب سے ہیں وہی کج ادائیاں

آہ! کیا کیا زخم تیرے ہجر میں کھاتے رہے!
زندگی بھر ہم تڑپتے اور تڑپاتے رہے!!
گریۂ خوں ہی رہا ہے ترجمانِ دردِ دل
پرسشِ احوال پہ آنسو ہی بھر آتے رہے
میرے آنسو بھی غضب کے سوز سے لبریز تھے
اور بھی یہ شعلہ ہائے غم کو بھڑکاتے رہے
میری آہیں شعلہ سامان و شرر افشاں رہیں
میرے نالے بھی جہاں میں آگ برساتے رہے
بیٹھے بیٹھے جب کبھی تڑپا گیا تیرا خیال!

روح پر تاریک بادل غم کے چھاجاتے رہے

کیسے کیسے ماہ پارے ہوگئے پیوندِ خاک!

آہ! اس گلشن میں کیا کیا پھول مرجھاتے رہے!!

اب کہاں ہیں دل میں وہ نقش و نگارِ آرزو!

اس خرابے میں ہزاروں سیلِ غم آتے رہے،

سجدہ گاہِ شوق تھا تیرا ہی سنگِ آستاں

حضرتِ شیخِ حرم گو مجھکو بہکاتے رہے!

سب کی سب باتیں سنیں، منہ سے نہ کچھ بولا مگر،

دیر تک احباب "صہبائی" کو سمجھاتے رہے

۱۳۱

سخت بے پروا تھا، آخر ناگہاں مارا گیا
عشق کی یورش میں قلبِ ناتواں مارا گیا!

آہ! منزل تک نہ پہنچا کاروانِ آرزو!
راہ میں ہی کارواں کا کارواں مارا گیا

تھا دلِ بیچارہ تنہا، اور ہجومِ رنج و غم
جانے اس گھمسان میں اب وہ کہاں مارا گیا!

سوزِ الفت ہی پہ تھا جسکا مدارِ زندگی
سوزِ الفت ہی سے وہ آتش بجاں مارا گیا

جسکے نغموں میں تھی رقصاں موجِ صہبائے نشاط
آہ! وہ رنگیں نوا، جادو بیاں مارا گیا!!

جسکے دم سے تھا بپا ہنگامۂ دورِ طرب
حسرتا! وہ جانِ بزمِ دوستاں مارا گیا!!

آپکی تو دل لگی ہی دل لگی ہوتی رہی
اور ناحق اک غریب اے مہرباں مارا گیا!

یاد ہے تمکو بھی وہ صہبائے رنگیں مزاج
کارزارِ عشق میں وہ نوجواں مارا گیا!

۱۰/۹/۳۱

دشتِ جنوں میں خاک بسر پھر رہا ہے اب
آنا تھا یہ بھی دور دلِ غم نصیب پر!

کل تک اسی اشک کا بہت احترام تھا
پتھر برس رہے ہیں مگر اب غریب پر

تمہارے پوچھنے پر کہدیا تھا حالِ دل اپنا،
یہ کیا معلوم تھا سن سن کے تم یوں مسکرا دو گے!

۷۰

زندگی بھر گردشِ شام و سحر ہوتی رہی — تھی کبھی بیدار قسمت اور کبھی سوتی رہی
اے خوشا وہ دل کہ تیری یاد میں مضطر رہا! — اے خوشا وہ آنکھ تیرے غم میں جو روتی رہی!!

۷۱

دل کی بربادی پہ بھی آہ و بکا مت کیجئے! — نذرِ ہستی کی تمنا ہے تو جرأت کیجئے!
بے لبِ تقدیر کی یورش سے ہم مٹے — کس کا شکوہ کیجئے؟ کس سے شکایت کیجئے!!

حریمِ ناز میں میری نماز ہو جائے — جبینِ شوق سراپا نیاز ہو جائے!!
ہر ایک شے میں درخشاں ہے جلوۂ معشوق — مری نگاہ اگر پاکباز ہو جائے
پھر آرزوؤں سے معمور ہو گیا اے حسن! — دیارِ دل پہ پھر اک ترکتاز ہو جائے!!

یہ میری زیست کا حاصل ہی آپکا لیا ہے! — اگر نگاہِ محبت نواز ہو جائے !!

کچھ ایسا نغمۂ بیتاب چھیڑ اے مطرب! — کہ بیقرار مرے دل کا ساز ہو جائے !!

مری نگاہ میں پھر کیا ہے گردشِ گردوں! — تری نگاہ اگر کارساز ہو جائے !!

وہی ہے رندِ حقیقت شناس ٹھروں میں — کہ پیرِ میکدہ سے بے نیاز ہو جائے!

تلاشِ خویش میں گم ہوں، یہ کیا قیامت ہے! — کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے !!

نہ کٹ سکے گی شبِ تارِ زندگانی کی، — یہ داستانِ محبت دراز ہو جائے !!

بہشتِ زیست ہے سوز و گدازِ عشق اثرؔ!
خوشا وہ دل کہ سراپا گداز ہو جائے !

دل میں اب ذوقِ آرزو ہی نہیں ! — لب کو اب شوقِ گفتگو ہی نہیں !!

غرقِ افسردگی ہے غنچۂ دل — اب وہ پہلا سا رنگ و بو ہی نہیں !

تیرہ و تار ہے فضائے حیات — جلوہ آرا وہ ماہ رُو ہی نہیں

گلشنِ آرزو ہُوا ویراں ، ! آہ! وہ جانِ آرزو ہی نہیں
آہ! اے ساقیٔ نشاط فزا کیف زا ساغر و سبُو ہی نہیں
مستیوں سے شراب خالی ہے روح میں شورِ ہاؤ ہو ہی نہیں

اے مری جان! اے مری "راحت"!
زندگی کیا ہو؟ جبکہ تو ہی نہیں

"کیفِ تصوّر"

شبِ سیاہ کی مانند زندگانی ہے مرے لبوں پہ ترے عشق کی کہانی ہے
تمہاری یاد مری سوچ کی ہے سرمستی تمہارا ذکر مرے دل کی شادمانی ہے
یہ میرا سینۂ تاریک جگمگا اٹھا! تمہاری شمعِ محبت کی ضوفشانی ہے
تمہارا پیکرِ رنگیں ہے سامنے میرے یہ میری چشمِ تصوّر کی کامرانی ہے

تمہارا جلوۂ سرشار ہے نشاط انگیز مری رگوں میں رواں موجِ ارغوانی ہے
وہی تمہاری نگاہوں کی شرمگیں مستی وہی تمہارے تبسم کی گلفشانی ہے
وہی ہیں پیار کی، راز و نیاز کی باتیں وہی تمہاری محبت بھری جوانی ہے
وہی ہیں زمزمہ ہائے ربابِ عیش و نشاط وہی ریاضِ محبت کی گلفشانی ہے
وہی ہیں چاندنی راتیں، وہی بہار کے دن وہی شباب کی جادو بھری کہانی ہے
وہی ہے نغمۂ سازِ عبودیت میرا! وہی نیاز، وہی نازِ مدح خوانی ہے

طرب فروز ہے کیفِ تصورِ "راحت"
مرے لئے یہی فردوسِ جاودانی ہے

۲۳۱

جلوۂ حقیقت، گر بے نقاب ہو جائے میرے دل کا ہر ذرہ آفتاب ہو جائے
موت کے سوا یارب! اب وہ اور کیا مانگے! جس غریب کو جینا اک عذاب ہو جائے
زندگی محبت ہے، زندگی اسی کی ہے جو حریمِ الفت میں باریاب ہو جائے

مینائے دل میں رقصاں صہبائے آرزو ہے
وہ جانِ رنگ و مستی پھر میرے روبرو ہے!
چھایا ہوا ہے دل پر رنگِ بہار گویا!
ہر بات نغمہ زا ہے، ہر سانس مشکبو ہے
وہ مد بھری نگاہیں مستی لٹا رہی ہیں!
پھر دل کے میکدے میں اک شور ہاؤ ہو ہے
بدمست ہو رہا ہے گلشن کا ذرہ ذرہ
ہر شاخ ایک ساقی، ہر پھول اک سبو ہے
رنگینیاں تمہارے جلووں کی گلفشاں ہیں
بیخود ہے بزم ہستی، سرشار رنگ و بو ہے
ہر ساز میں تمہارے نغمے بسے ہوئے ہیں

ہر پھول میں تمہاری تصویر ہو بہو ہے
اک نور کا تلاطم، اک گلشن تبسم
میرے حریم دل میں یہ کون خوبرو ہے!
دیر و حرم کے جھگڑے ہر سو چھڑے ہوئے ہیں
لیکن مرے لبوں پر تیری ہی گفتگو ہے
جانے کہاں ہیں؟ کیا ہیں؟ حور و بہشت و کوثر
میرے لئے تو سب کچھ اے جان! تو ہی تو ہے
دنیا سے گوشہ گیری عقبیٰ سے بے نیازی
"راحت"! ترے گدا کی یہ بھی عجیب خو ہے!!

۴۷ — ۱۲/۱/۳۴

وہ حسنِ سحر پرور روپوش ہو گیا ہے — میرا ربابِ دل بھی خاموش ہو گیا ہے
چپ ہو گئیں صدائیں، غش کر گئیں ہوائیں — گویا تمام عالم بے ہوش ہو گیا ہے

۲/۳

دل، کہ تمہارے عشق میں درد سے آشنا ہُوا

ریزۂ سنگ تھا مگر گوہرِ بے بہا ہُوا!

میرا سرِ جنوں پسند، دیر و حرم میں تھا بلند

تیرے حضور میں مگر شوق سے ہے جھکا ہُوا

فصلِ بہار آگئی، سارے جہاں پہ چھا گئی

میرا دلِ حزیں مگر سوگ میں ہے پڑا ہُوا

دل، کہ ریاضِ طور تھا، میکدۂ سرور تھا

آج وفورِ یاس سے خاک میں ہے ملا ہُوا

ٹوٹ گیا ہے سازِ دل، فاش ہُوا ہے رازِ دل

سوزِ شکستِ آرزو نالوں میں ہے بھرا ہُوا

بحرِ جہاں ہے بیکراں، زیست حبابِ ناتواں
موجِ فنا ہوئی رواں، دم میں وہیں ہوا ہُوا!
"راحتِ جاں"! ترا اثر سب سے ہُوا ہے بیخبر
اک ترا ذکر ہے مگر، تارکِ ما سوا ہُوا

۸ ۲/۲۴

روح فزا، نظر نواز، نقش و نگارِ زندگی!
سینہ فگار و جاں گداز، نشترِ خارِ زندگی
فصلِ بہارِ مے فروش، جام بکف، سبو بدوش
وقفِ خروشِ ناؤ نوش بادہ گسارِ زندگی
قلب و جگر ہیں چاک چاک آنکھ میں اشک سر پہ خاک
دشتِ جنوں میں ہے رواں سینہ فگارِ زندگی
اسکا نشاط غم نشاں، اسکی بہار میں خزاں

وائے نشاطِ زندگی، ہائے بہارِ زندگی !!

تیرگیٔ شبِ عدم، چھایا ہُوا ہے ابرِ غم
اس میں ستیزہ کار ہے تابِ شرارِ زندگی !
دل میں ہے سیلِ آرزو، کور ہے چشمِ جستجو
تیرہ و پُر فریب ہے راہگُذارِ زندگی
عیش نظر فریب ہے، غم بھی مگر فریب ہے
ایک فسوں ہے گردشِ لیل و نہارِ زندگی !
میری بہار لُٹ گئی، مجھ سے وہ آہ چھُٹ گئی!
"راحتِ روح" جس سے تھی میری بہارِ زندگی

۷۴ ۹ ۲/۳۴

دل ہے اندوہناک تیرے بغیر غم سے ہے چاک چاک تیرے بغیر
تو نہیں تو جہان سُونا ہے ! عید اپنی ہو خاک تیرے بغیر

۱۰۳۲

سیلِ خوں ناب دبانے سے دبایا نہ گیا! رازِ دل ہم نے چھپایا پہ چھپایا نہ گیا

اک قیامت ہے محبت کی جدائی ہمدم! اے خوشا دل، کہ جو اس سمت کو آیا نہ گیا

اُف! دلِ زار کی ہمت کہ اٹھایا اس نے بار، جو کوہِ گراں سے بھی اٹھایا نہ گیا!

بزمِ زیبائے تمنا ہوئی تاراجِ خزاں نہ گیا دل سے مگر داغِ تمنا نہ گیا!

حسن تو محفلِ ہستی میں رہا جلوہ طراز مری نمناک نگاہوں سے ہی دیکھا نہ گیا

میری خاموش نگاہوں نے کہا قصۂ غم حالِ دل کا لبِ گویا سے سنایا نہ گیا

تم مجھے پھر بھی ملو گی، یہی امید رہی آہ! تا زیست مرے سر سے یہ سودا نہ گیا!

جوئے اشک آنکھوں سے بہتی بھی رہی شام و سحر شعلۂ غم تھا کچھ ایسا کہ بجھایا نہ گیا!

مجھکو محبوب رہا تیری ہی تربت کا طواف شیخ کعبے کو، برہمن سوئے بتخانہ گیا

زندگی نے ہی نہ کی مجھ سے وفا راحتِ جاں!
مجھ سے جی بھر کے ترے ہجر میں رویا نہ گیا

۲
۲۴

ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسم زندگانی
کبھی شام نامرادی، کبھی صبح کامرانی
کبھی نالہائے فرقت، کبھی نغمہائے الفت
کبھی سوزِ نوحہ خوانی، کبھی سازِ شادمانی
کبھی چشم خونچکاں ہے، کبھی دل طرب نشاں ہے
کبھی جام خونِ دل ہے، کبھی جام ارغوانی
کبھی جوشِ مے پرستی ہیں نشاطِ رقصِ مستی
کبھی مثلِ نیشتر ہے خلشِ غمِ نہانی!

وہ مرا شباب رنگیں، وہ شراب کیف آگیں
وہ سیاہ مستیوں کی طرب آفریں کہانی
یہ نظارۂ جہاں تھا، کہ جمالِ گلفشاں تھا
یہ مرا ریاضِ دل تھا، کہ بہشتِ شادمانی!
مگر آہ! آج کیا ہے! اِک شرار بجھا ہوا ہے
یہی ایک داغ باقی ہے شباب کی نشانی
نہ وہ ساغر و سبو ہے، نہ خروشِ ہاؤ ہو ہے
نہ دماغِ آرزو ہے، نہ ہوائے زندگانی

یہ مگر فسونگری ہے، یہ طلسم زندگی ہے،
نہ خوشی، نہ بیدلی ہے، نہ الم نہ شادمانی،

نہ تو عیش کو بقا ہے نہ تو غم ہی لا فنا ہے، مری زندگی ہی کیا ہے، فقط اک حباب فانی

مرے قلبِ ناتواں نے بہت انقلاب دیکھے کبھی پستیوں کی ذلت، کبھی اوجِ آسمانی
کبھی تھی صنم پرستی، کبھی میکدے کی مستی کبھی تھا طوافِ کعبہ، کبھی شغلِ سبحہ خوانی
مگر اب عدم نشاں ہیں وہ مناظر اب کہاں ہیں! تھے تمام نقشِ باطل، تھے تمام نقشِ فانی

مری جان و دل کی راحت! مری روح کی مسرت! تری شمعِ عشق کی ہے مرے دل میں ضَو فشانی،
مرے عشق کا ترانہ، ترے حسن کا فسانہ مرے سازِ دل میں رقصاں ہے شرر غیر فانی
مرا دل گدازِ الفت، مری روح سازِ الفت!
مرا سوز مستقل ہے، مرا ساز جاودانی

۷۴

انقلابِ آسماں شام و سحر ہوتا رہا! نقشۂ بزمِ جہاں زیر و زبر ہوتا رہا!
مد و جزرِ بحرِ ہستی ہیں یہ غمہا و نشاط یہ تماشا زندگی بھر اے اثرؔ ہوتا رہا!

دفترِ عقل و خرد، دفترِ باطل ٹھہرا، آخرِ کار یہی فیصلۂ دل ٹھہرا،

۲۶

موجزن ہے حسن کا اک بحرِ ناپید اکنار! ہائے یہ طوفانِ رنگ و بو، یہ گلہائے بہار!!
پیکرِ معصومیت دوشیزۂ صبحِ طرب! مستِ رقص و مے فشاں لیلائے شامِ مشکبار
چودھویں کے چاند میں رقصاں ہے صہبائے جنوں مست و بیخود ہیں فضائیں اور ہوائیں نغمہ بار
جنگلوں میں جشن ہیں گلہائے رنگا رنگ کے بج رہے ہیں کوہساروں میں ربابِ آبشار
پھوٹ نکلا ذرے ذرے سے جمالِ گلفشاں سرمدی نغموں سے سازِ زندگی ہے بیقرار
اے مری "راحت"! اگر گیا ہیں تمہارے ہجر میں! یہ تبسم ہائے گلشن، یہ نواہائے ہزار

آہ! یہ ہنگامۂ مستی! یہ دورِ سرخوشی! کر رہے ہیں میرے دل کو اور بھی زار و نزار
چاندنی راتوں میں پہروں بیٹھ کر روتا ہوں میں آہ! وہ عہدِ محبت! آہ! وہ دورِ بہار!!
قلبِ غم پرور ہے یا افسردگی کا ڈھیر ہے وائے میری زندگی! وائے سرِ کلیل و نہار!

میری آنکھیں گریہ ساماں، میرا دل حرماں نصیب
میری صبحیں اشک افشاں، میری راتیں سوگوار

تمہاری یاد میں دنیا کو ہوں بھلائے ہوئے
تمہارے درد کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے
شبِ سیاہ پہ ہیں غم کے ابر چھائے ہوئے
سحر کی آنکھ میں آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے،
ہمارے زخمِ جگر کے ہیں خوشنما پردے
یہ قہقہے، کہ ہیں دنیائے غم چھپائے ہوئے

عجیب سوز سے لبریز ہیں مرے نغمے !
کہ سازِ دل ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے
بہارِ لالہ و سرو و سمن کو کیا دیکھوں !
مری نظر میں ترے جلوے ہیں سمائے ہوئے
جو تجھ سے کچھ بھی نہ ملنے پہ خوش ہیں اے ساقی !
کچھ ایسے رند بھی ہیں میکدے میں آئے ہوئے
بہشتِ ذوقِ نظر ہے وہ جلوۂ رنگیں
لبوں پہ موجِ تبسم، نظر جھکائے ہوئے
تمہارے ایک تبسّم نے دل کو لوٹ لیا !
رہے لبوں پہ ہی شکوے لبوں پہ آئے ہوئے
وہ رندِ شوخ کہ دیر و حرم میں سرکش تھا
ترے حضور میں بیٹھا ہے سر جھکائے ہوئے

اٹھ بھی راہروِ دشتِ زندگانی ہے
پہاڑ غم کا دلِ زار پہ اٹھائے ہوئے

۱۲۴/۳۲

ذکرِ "راحت" پہ اشک بھر آئے
میری آنکھوں کو کون سمجھائے!

کیا کہیں تجھ سے سرگذشت اپنی!
زخم دل پہ ہزار ہا کھائے

جس پہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے
وہ نہ مر جائے تو کدھر جائے!

اس چمن میں کھلے ہزاروں پھول
اور ہزاروں ہی کھل کے مرجھائے

چاندنی رات صحنِ گلشن ہے
کاش! ایسے میں تو بھی آجائے!

نہ کھلا عقدۂ فریبِ امید
ہم نے دھوکے ہزار ہا کھائے

نہ چھٹا تیرا ذکر "راحتِ جاں"!
گو ہزاروں ہی انقلاب آئے

رباعی

محبت بیخودی ہے سرخوشی ہے — محبت ہی بہارِ زندگی ہے
مری دیوانگی پر عقل قرباں — تمہارے عشق کی دیوانگی ہے
شایادل لگی ہی دل لگی میں ، ! — تمہاری بھی غضب کی دل لگی ہے!

غزل

یہ آہوں کی جو شعلہ سامانیاں ہیں — محبت کی گویا گل افشانیاں ہیں
الٰہی ہماری بھی کیا زندگی ہے!! — پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں
کوئی مٹ گیا ہے تو تیری بلا سے — مری جاں! تجھے کیوں پشیمانیاں ہیں؟!
نثار ان پہ کون و مکاں کی فراست! — عجب شے محبت کی نادانیاں ہیں
سرِ غزنوی! آستانِ ایازی!! — محبت کی بھی کیا جہانبانیاں ہیں!!
حقیقت میں ہے یہ گہرباریٔ عشق — یہ آنکھوں کی جو گریہ سامانیاں ہیں!

اثرؔ! میرے اشعار ہیں دل کے نالے
غزلخوانیاں، مرثیہ خوانیاں ہیں

۱۷

نہیں جاتی محبت کی پریشانی نہیں جاتی — یہ نادانی سہی لیکن یہ نادانی نہیں جاتی

جلا کر باغِ ہستی کو نہ جبتک خاک کر ڈالے — دلِ آتش بجاں کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

جہاں میں یوں تو آبادی بھی، بربادی بھی ہے لیکن — دل ایسا مٹ چکا ہے دل کی ویرانی نہیں جاتی

تمہارا تذکرہ ہے اک پیامِ گریۂ پیہم — مری آنکھوں کی پھر اشک افشانی نہیں جاتی

تمہارے ہجر میں شام و سحر روتا رہا، لیکن — ابھی تک چشمِ تر کی گریہ سامانی نہیں جاتی

یہ مانا کچھ کمی تیرے خزانے میں نہیں یارب! — مگر بیماریٔ غم بھی بآسانی نہیں جاتی

تری برقِ تبسم نے مجھے دیوانہ کر ڈالا — کہ دل کی بےکلی، آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی

ترے جلوے اگرچہ چھپ گئے میری نگاہوں سے — مرے شوقِ محبت کی فراوانی نہیں جاتی

ہر اک ارماں اب مٹ گیا تو کیا ہوا اٹھنا ہی تھا مجھکو — تری آنکھوں سے اب تک کیوں پشیمانی نہیں جاتی!!!

محبت نے اثر کو اسقدر بیحال کر ڈالا

کہ بیچارے کی اب تو شکل پہچانی نہیں جاتی

زاہد کو خدا کی جستجو ہے	میکش کی زباں پہ "یا سبو" ہے!

"صہبائی" بے نوا کو سب کچھ	اے "راحتِ روح"! تو ہی تو ہے

۲۱ ۱۱/۳۲

ڈوبے ہوئے ہیں مہر و ماہ تیری تجلیات میں

غرق ہیں لالہ و سمن تیرے تبسمات میں!

تیرا ہی حسن ہو بہو، چھایا ہوا ہے سو بسُو،

پیشِ نظر ہے تو ہی تو عالمِ شش جہات میں

بزمِ جہاں غریقِ مے، مستِ طرب ہر ایک شے،

نغمۂ عشق کی ہے لے ہر ربطِ کائنات میں

دل میں ایاغِ آرزو، لب پہ مرے سبُو اسبُو!!

خوب ہے کیفِ ہاؤہُو، میکدۂ حیات میں

تیرے خیال میں ہوں گم، تیرے جمال میں ہوں گم

کیفِ وصال میں ہوں گم، گم ہوں تصوّرات میں

۱۱/۳۲/۹

خمخانۂ نشاط کا اک رندِ مست ہوں
ساقی سبو بدوش، میں ساغر بدست ہوں

تیرا ہی حسن سجدہ طلب ہر صنم میں ہے
زاہد سمجھ رہا ہے کہ میں بت پرست ہوں

مجھکو دماغِ نغمہ سرائی کہاں ہے اب!

اپنے ہی سازِ دل کی صدائے شکست ہوں

۱۳/۱۱/۳۲

بادۂ عشق پی کے مست ہوئے
بے نیازِ بلند و پست ہوئے

کعبہ و دیر میں تو کچھ نہ ملا!
آخر کار مے پرست ہوئے

ان کے انکار نے کیا بے باک!

اور بھی ہم دراز دست ہوئے!

تیری بہار جانفزا لالہ و یاسمن میں ہے، تیرا جمالِ دلکشا تاروں کی انجمن میں ہے
بادِ صبا میں تیری ہی نکہتیں ہیں بسی ہوئی تیرا ہی جلوہ ضو فشاں پھولوں کے پیرہن میں ہے
نغمہ سرا ہے آبشار مستِ طرب ہے لالہ زار تیرا ہی سازِ بیقرار موجِ شکن شکن میں ہے
کعبہ و دیر میں عبث ہم تجھے ڈھونڈتے رہے تو ہی کلی کلی میں ہے تو ہی چمن چمن میں ہے،
مہر میں شعلہ بار ہے تیرا شبابِ آتشیں تیری نگاہ شرمگیں چاند کی ہر کرن میں ہے،
رنگ ترے سکوت کا وادی و کوہسار میں رنگ ترے سرور کا رابطۂ انجمن میں ہے
حسنِ ازل سبو بدوش، روحِ غزل نوا و نوش لاکھ جوانیوں کا جوش موجِ مئے کہن میں ہے،

رنگ ترے خیال کا، فیض ترے جمال کا!

کیف ترے وصال کا، میری مئے سخن میں ہے

۳۶

تمہاری فرقت میں میری آنکھوں سے خوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں
سپہرِ الفت کے ہیں ستارے کہ شامِ غم میں چمک رہے ہیں
عجیب ہے سوز و سازِ الفت، طرب فزا ہے گدازِ الفت
یہ دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں، کہ لالہ و گل مہک رہے ہیں!
بہار ہے یا شرابِ رنگیں! نشاط افروز، کیف آگیں!
گلوں کے ساغر چھلک رہے ہیں، گلوں پہ بلبل چہک رہے ہیں
جہاں پہ چھایا سحابِ مستی، برس رہی ہے شرابِ مستی
غضب ہے رنگِ شبابِ مستی، کہ رند و زاہد بہک رہے ہیں!
گر آتش ہے خموش و حیراں، حواس گم، چاک چاک داماں
لبوں پہ آہیں، نظر پریشاں ہے، رخ پہ آنسو ڈھلک رہے ہیں

اثرؔ جان دے دی رہِ عاشقی میں
کیا ہے یہی کام اک، زندگی میں

کئے جاؤ تم شوق سے جورِ پیہم
ہماری خوشی ہے، تمہاری خوشی میں

چمن میں ترے جلوے بکھرے پڑے ہیں
ترا حسنِ معصوم ہے ہر کلی میں ،!

تمہارے تصور کی دنیا میں گم ہوں
یہ کیا سحر ہے چاند کی چاندنی میں!

یہ ملنا تمہاری ہنسی دل لگی تھی ،!
مگر مٹ گئے ہم تری دل لگی میں

عجب بیکلی عشق کی بیکلی ہے
بہشتِ مسرت ہے اس بیکلی میں

وہی ساعتیں حاصلِ زندگی ہیں
گذر جائیں جو مستی و بیخودی میں

اثرؔ کیا کہیں فسانہ ویرانیٔ دل!
نہیں کوئی بھی لطف اب زندگی میں

خدا کو ڈھونڈ رہا تھا، مگر خدا نہ ملا! مجھے تو سجدے کو تیرا ہی آستانہ ملا

شباب تھا کہ خمستانِ کیف و مستی! جدھر نگاہ اٹھائی شرابخانہ ملا

سنا رہے ہیں وہ سب کو مرا فسانۂ عشق ہماری جان گئی ان کو اک فسانہ ملا

تجھے خدا کی حقیقت کی کاوشیں زاہد! مجھے خود اپنی حقیقت کا کچھ پتا نہ ملا

ازل سے یاس کو کد ہے مری تمنا سے ہزار چیز ملی، دل کا مدعا نہ ملا!

اب اشکبار ہوں انجامِ جستجو پہ اثر
مجھے خدا تو ملا، دردآشنا نہ ملا!

بارشِ درد و غم و آلام صبح و شام ہے یاالٰہی! زندگانی کیا اسی کا نام ہے!!

دل شکستہ، آنکھ گریاں، روح گھبرائی ہوئی آہ! کیا آغازِ الفت کا یہی انجام ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ستارے

۱

تری نگاہ کا اعجاز ہے کہ شیشۂ دل
ہزار بار ہے ٹوٹا ہزار بار بنا

۲

مہلت اک دم کی خدا کیلئے اے ملک الموت
حسرت دید رخ یار رہی جاتی ہے

۳

اس چمن میں ہیں کئی اور اسیران خموش
تو ہی اک بلبل شوریدہ تہ دام نہیں

۴

غم فراق یہاں ہے وہاں ہے شکوۂ گل
قفس میں چین ہے مجھ کو نہ آشیانے میں

(۵)

تبسم کھیلتا ہے جب کسی معصوم کے لب پر
ریاضِ دہر میں جنت کے گویا پھول کھلتے ہیں

(۶)

چھپ گئے تارے فلک پر بجھ گئی شمعِ سحر!
چھا گئی ہے کیا اداسی سی دلِ مہجور پر!!

(۷)

ہم نے مانا کہ وہ ہے درد کا درماں لیکن
اے دلِ زار اگر آنکھ اٹھائی نہ گئی؟

(۸)

تارے محوِ رقصِ بیخودی ہیں آسماں لرزاں
یہ کس مہوش نے چھیڑا رات کو تارِ رباب اپنا
مری خاموشیوں میں مضطربِ موجِ تمنا ہے
نہیں چھپتا چھپائے سے بھی یارب اضطراب اپنا

(۹)

ہر داغ تیرے حسن کی تصویر بن گیا
ہر سانس تیرے عشق کا افسانہ ہو گئی
رگ رگ میں اک سرور ہے سوز و گداز ہے
ساقی کی چشمِ مست ہی پیمانہ ہو گئی

(۱۰) اللہ رے التفاتِ نگاہِ جنوں نواز ۔ بیگانہ کر دیا ہمیں دونوں جہان سے

(۱۱) ہوا ہے ذرہ ذرہ خاک کا مثلِ گہر تاباں ۔ جلایا کس کی برقِ حسن نے میرے نشیمن کو!

(۱۲) مئے تسکیں پلا دی ہے مرے قلبِ پریشاں کو ۔ خدا دونا کرے اے پیرِ میخانہ احسانِ جاوداں تیرا
تجھے دلبستگی ہے اسقدر کیوں دشتِ غربت سے ۔ ارے غافل کبھی فردوس میں تھا آشیاں تیرا

(۱۳) فصلِ گل، صحنِ چمن، لطف و عطائے ساقی ۔ زاہدا! دل میں مرے خواہشِ جنت کیوں ہو؟
صحنِ گلشن میں کوئی مونس و غمخوار بھی تھا؟ ۔ گوشۂ قیدِ قفس سے مجھے وحشت کیوں ہو؟

(۱۴) نہ الم کا مجھکو الم رہا، نہ خوشی کی مجھکو خوشی رہی ۔ تری یاد میں وہ طلسم تھا کہ عجیب بیخبری رہی

(۱۵) روح کانپ اٹھتی ہے اک حشر بپا ہوتا ہے ۔ ہائے وہ نالہ کہ نغمے میں ادا ہوتا ہے!

(۱۶) اب خواب ہے شباب کا وہ دورِ اولیں ۔ رنگینیِ خیال کی دنیا کہیں ہے!

(۱۷) دل کو خراب کر دیا میکدۂ شباب نے ۔ روح کو جذب کر لیا زمزمۂ رباب نے

(۱۸) کیا کیا تھے اضطراب دمِ عرضِ مدعا! ۔ کیا کیا سخن زبان پہ آ آ کے رہ گئے!

(۱۹) اللہ عجیب یہ دنیا کا کارخانہ ہے ۔ کہیں فغاں ہے کہیں عیش کا ترانہ ہے

فلسفی کہتا ہے سب کچھ وہم ہے لیکن اثرؔ (۲۰) دل یہی کہتا ہے پردے میں کوئی مستور ہے

اک پیکرِ بہار ہے آنکھوں کے سامنے (۲۱) کیفِ تصورِ رخِ زیبا نہ پوچھیے!

جو یہاں محوِ ماسوا نہ ہوا ، ! (۲۲) رنج و غم سے وہ آشنا نہ ہوا

چارۂ وحشتِ دل کوششِ لاحاصل ہے (۲۳) جا کے صحرا میں اثرؔ اور پریشاں ہونگے

دلِ بیقرار کیوں اب کچھ چپ سا ہو گیا ہے؟ (۲۴) وہی آ رہا ہے جسکی تھی تباہی جدائی!

رلانا ہنستوں کا مشکل نہیں ہے اے شبنمؔ! (۲۵) مزا تو جب تھا کہ روتوں کو بھی ہنسا دیتی

مری نظر میں وہی پیکرِ جمال رہا ! (۲۶) کہ خواب میں بھی اسی کا مجھے خیال رہا!

یہی ہے عالمِ وحشت تو پھر خدا جانے!
اڑیگی گور کی مٹی کہاں کہاں میری!
(۲۷)
وہ آئے دامِ تمنا میں غیر ممکن ہے
فریب دیتی ہیں کوتاہ دستیاں میری!

پشیماں کر دیا کیا انکو میرے خونِ ناحق نے (۲۸) الٰہی! وہ مری تربت پہ کیوں خاموش بیٹھے ہیں

ہر گھڑی لب پہ آہ ہوتی ہے (۲۹) زندگانی تباہ ہوتی ہے

دشت و صحرا کہ صحنِ گلشن ہو (۳۰) ہے وہیں کچھ سکوں جہاں تو ہے

دل کا خلوت کدہ جھلک اٹھا (٣١) تھا تبسم کسی کے لب پہ اثرؔ!

کہیں ہمارے چمن کی یہی بہار نہ ہو؟ (٣٢) سمجھ رہے ہو خزاں جسکو اے طپیدہ دلو!

تقاضائے محبت ہے سراپا مدعا ہو جا! (٣٣) خرد کہتی ہے اسکی آرزو اچھی نہیں اے دل!

کہیں جو حسن کی تصویر دیکھ پاتے ہیں! (٣٤) ہیں تھام لیتے وہیں دل کو دونوں ہاتھوں سے

فلک پہ حسنِ ازل بے نقاب نکلا ہے (٣٥) جہاں میں دھوم مچی آفتاب نکلا ہے

دیر و حرم میں لیکن تیرا نشاں نہ پایا! (٣٦) تجھکو کہاں نہ دیکھا! تجھکو کہاں نہ پایا!

میری ہنسی میں بھی اب تاثیر ہے غمی کی (٣٧) بس ہو چکی ہے ظالم! اک حد ہے دل لگی کی

کیا جانئے کیا ہو جو لگاوٹ کی نظر ہو (٣٨) اندازِ تغافل پہ مٹا جاتا ہوں یا رب!

دن سیہ ہو تو کوئی صبح نہیں شام نہیں (٣٩) بختِ واژوں کیسی گردشِ ایام نہیں

صبحِ امید صبحِ قیامت سے کم نہیں (٤٠) کیا پوچھتے ہو حال مری شامِ ہجر کا!

"بنا بنا کے مٹا اور مٹا مٹا کے بنا!" (٤١) لکھا ہے کلکِ ازل نے یہی مقدر میں

ٹوٹ جاتے ہیں کئی دل ایک صبح و شام میں (٤٢) کسقدر سفاکیاں ہیں گردشِ ایام میں

شکوہ کس منہ سے کریں ظلمتِ شامِ غم کا! (۴۳) صبح ہوگی بھی اگر صبحِ قیامت ہوگی

ہوس اک آگ ہے جو روح کو برباد کرتی ہے (۴۴) محبت اک ضیائے ظلمتِ صحرائے ہستی ہے

جلوہ فرما ہے مرے دل کے صنمخانے میں (۴۵) وہ نہ کعبے میں ہے اے شیخ نہ بتخانے میں

ہجومِ سجدہ ہے کیوں اے فریب خوردۂ حسن! مجازِ پردۂ رنگیں ہے بزمِ ناز نہیں!
(۴۶)
ستم بھی لطف ہے گر اے اثر مجھی پہ ہوا کرم بھی ظلم ہے جس میں کچھ امتیاز نہیں

فریب خوردہ ہوں زاہد! گناہگار نہیں (۴۷) بتوں کے حسن پہ حسنِ ازل کا دھوکا ہے

ترے بتوں کی پرستش تری پرستش ہے گیا جو دیر میں کیونکر گناہگار ہوا؟
(۴۸)
پلا دیا جسے اک جرعۂ چشمِ ساقی نے اثر! وہ مست نہ تا حشر ہوشیار ہوا!

جو بات اثر نے کی گنجینۂ عرفاں تھی (۴۹) کہتے ہیں سبھی لیکن آوارہ و مجنوں تھا

ہمارے دل کی کلی اے اثر! نہیں کھلتی (۵۰) خزاں کے بعد سنا ہے بہار ہوتی ہے

ہے کون پردۂ رنگِ مجاز میں پنہاں! (۵۱) یہ حسن روح کو کیوں بیقرار کرتا ہے!

ہوس پرست نہیں ہوں ادا پرست ہوں میں (۵۲) صنمکدے میں ہوں لیکن خدا پرست ہوں میں

وہ کیا تاثیر ہے یارب کسی کی چشمِ مِسگوں میں (۵۳) کہ میری صبح اک گھونٹ پر سرشار ہوتی ہے

جو ٹیس دل کی ہے اسکو زباں کیا جانے! (۵۴) لگی ہے جسکے وہی جانے یا خدا جانے!

اسے کیا خبر ہے کیسے دیکھتے ہیں، ! (۵۵) گماں پھول کو ہے جسے دیکھتے ہیں

(۵۶)

مرے دل میں شامِ فراق کیوں، نہ سکوں نہ صبر و قرار ہے

جو ہے سانس دودِ سیاہ ہے، جو ہے داغ برق و شرار ہے

ہے طلسم کاریٔ خانۂ مژۂ دراز کہ لوحِ دل!

کبھی ہے خزینۂ آرزو، کبھی حسرتوں کا مزار ہے!

گلہ خزاں سے نہ فصلِ بہار سے مجھکو (۵۷) شکایتیں ہیں دلِ بیقرار سے مجھکو

ساقی سے ہاں ضرور ہے چشمک مگر اتنی! (۵۸) پیرِ مغاں سے مجھکو عقیدت ازل سے ہے

نہیں، کہ کوئی خوشی تھی شباب میں مجھکو
مزا ضرور ملا اضطراب میں مجھکو
(۵۹)
ہجومِ درد کی بیہوشیاں ہیں کیف نہیں
دیا ہے زہر ملا کر شراب میں مجھکو

کبھی نہ ہوش میں تیرا یہ بادہ نوش آیا ۶۰ اک اور جام چڑھایا جو ذرا ہوش آیا،
ہجوم شوق سے اٹھے ہیں جھوم جھوم کے رند یہ چاند عید کا نکلا کہ مے فروش آیا!

وہ جلوہ بار اگر ہو تو پھر یہ داغ کہاں ! ۶۱ جب آفتاب درخشاں ہو پھر چراغ کہاں

اسکی آنکھیں ہیں کہ اک گرداب ہے ساغر میں ہے ۶۲ سر مرا چکر میں ہے یا آسماں چکر میں ہے!

وہ آنکھیں ہیں کہ جن سے بادۂ فردوس جاری ہے ۶۳ یہ دل ہے یا کوئی میخوار وقفِ میگساری ہے،

فتنے جگا رہی ہیں، اور آپ سو رہی ہیں ۶۴ مدہوش کر رہی ہیں، مدہوش ہو رہی ہیں

اک میکدۂ بہار آنکھیں ۶۵ اللہ! یہ سحر کار آنکھیں!!

جو اضطراب ملا تھا تو سخت جاں فرسا ۶۶ اور اب سکوں جو ملا تو سکونِ یاس ملا

خدا کے کام ہیں اسمیں کسی کو دخل نہیں ۶۷ اثر سے مل کے طبیعت بہت اداس رہی

نہیں کچھ سینے میں ناسور ہی نہیں مجھکو ۶۸ علاج زخم کا منظور ہی نہیں مجھکو

وہ برگِ گل ہی یارب یا کوئی برقِ شرر افشاں ۶۹ نظر شاداب رہتی ہے جگر بیتاب رہتا ہے

طلسمِ رنگِ چمن کیا ہی کیف آور تھا ۷۰ سمجھ کے اسکی حقیقت بہت پشیماں ہوں

ساقی عجیب ہے تری چشم مست میں — دو ساغروں میں بزم کو مخمور کر دیا!

(۷۱) دل تیرہ خاکداں تھا مگر تیرے حسن نے — رنگینیوں سے ساغر پرنور کر دیا!

(۷۲) کعبہ ہے نہ بتخانہ نہ مسجد ہے نہ میخانہ — دل میں ہے اگر روشن شمع رخ جانانہ

(۷۳) اے کہ بہ سر کعبہ ہے وقف جبیں سائی ہے — تو کبھی سجدہ گہ اہل فلک ہوتا تھا!

(۷۴) یوں نہ مستوں سے الجھ اے محتسب! — پارسائی کا بھرم کھل جائیگا!

ہے سفینہ وہی کچھ خوف فنا سے آزاد — بحر کو بحر جو ساحل کو نہ ساحل سمجھا!

(۷۵) اسکی محفل میں کہاں تجھکو رسائی ہوگی — اکہ تو راہ کے ہر سنگ کو منزل سمجھا!

(۷۶) بال کھولے وہ بے نقاب آیا — گویا وقت سحر سحاب آیا!

یوں تو ہی قدرت کے ہم قائل ہیں لیکن بخدا — شام ہجراں کی بھلا کیونکر سحر ہو جائیگی!

(۷۷) یاد میں جسکی ہے گریاں آہ وہ ہیں مضطرب! — کیا ترے رونے کی اسکو بھی خبر ہو جائیگی!

اسیر آرزو ہوں دشت ہو یا گوشۂ زنداں — کہیں بھی ہو ہمارے پاؤں میں اک زنجیر رہتی ہے

(۷۸) ہوئی مدت کہ کعبہ چھٹ گیا لیکن ابتک — مرے دل کی شب تاریک میں تنویر رہتی ہے

آثؔر! خود اپنی حقیقت سے بیخبر ہوں میں (۷۹) کبھی حباب کبھی بحرِ بیکراں سمجھے

مضطرب کو نہ صحرا کیلیے ہی وہ جنوں! (۸۰) بزمِ ہستی کو جو اک گوشۂ زنداں سمجھا!

ذرّۂ خاک سے چمن ہو جا! (۸۱) آپ ہی اپنی انجمن ہو جا!!

اور بھی حسن ہی ٹیکے سے تمہارا چمکا (۸۲) خوب پیشانی کی قسمت کا ستارا چمکا

فرض نازِ نیست کیوں عبادت ہے! (۸۳) کیا مری قید با مشقت ہے؟

رو دیکا کب تک! سحر ہونیکو ہے (۸۴) اے آثؔر! اسوقت سونا چاہیئے!

دلِ سازِ شکستہ ہی چھیڑ اسکو نہ اے ہمدم! (۸۵) یہ دردِ صدا ہوگی جو بھی یہ صدا دیگا،

میں اسی کو خوشی سمجھتا ہوں،! (۸۶) کم اگر اضطراب ہوتا ہے!

بہار ہی تو اے آثؔر گلوں سے ہمکنار رہو (۸۷) خزاں کا دور ہی اگر تو محوِ انتظار رہو

آثؔر! افسردگی میں یوں ترے لب پہ تبسم ہے (۸۸) کہ جیسے پھول ہوں بکھرے ہوئے گورِ غریباں پر

روز کرتا ہوں قصرِ نو تعمیر! (۸۹) دو گھڑی کا جہاں قیام نہیں

جستجو جوہر ہے میری فطرتِ بے تاب کا (۹۰) بادیہ پیما ہوں آوازِ درا ہو یا نہ ہو!

ہے اندھیرا ہی اندھیرا آنکھ وا ہو یا نہ ہو (۹۱) ظلمت آبادِ جہاں میں کچھ نظر آتا نہیں

بے زبانی ہوئی زباں میری! (۹۲) سن رہے ہیں وہ داستاں میری

کاش مجھکو نہ زندگی ملتی! (۹۳) ایک ساعت کی بیخودی ملتی

اب زمیں ہے نہ آسماں اپنا (۹۴) آشیانے کو پھونکدے اے برق!

نہ ملا آہ! اس کا در نہ ملا!! (۹۵) ہم نے ڈھونڈا بہت مگر نہ ملا!

ہوتے ہیں جس کی گردِ راہ سے دیر و حرم پیدا (۹۶) وہی دل زندۂ شیخ و برہمن ہو تو کیونکر ہو

حشر کے روز بھی کیا خوب نظارا ہوگا (۹۷) سامنے جلوہ فشاں حسنِ خود آرا ہوگا

نگاہِ اولیں عنوان ہے بابِ محبت کا (۹۸) یہیں سے کچھ پتہ چلتا ہے اپنی اپنی قسمت کا

معمور ترے حسن سے داماں نظر ہے (۹۹) اب ہوش کسے شام ہے یا نورِ سحر ہے!

خضر کی زندگی نہ ہو جائے! (۱۰۰) ڈر رہا ہوں کہ زندگی میری!

لمحہ بھر کے لئے خوشی دیجے (۱۰۱) خضر کی زندگی کو کیا کیجے!

مرے اسرار بہم پر نہ کیوں جلوہ نما ہوتا! (۱۰۲) مری گمراہیاں شاید اسے منظور ہیں، ورنہ

گو وقفِ ارتعاش رہا سازِ زندگی! (۱۰۳) لیکن سمجھ میں آ نہ سکا رازِ زندگی

(۱۰۴)

اگر نہیں ہے ہر ایک شے پر اسی فروغِ نظر کا پرتو

تو پھر ہر اک جلوۂ حسیں پر نگاہ یوں بیقرار کیوں ہے!

(۱۰۵)

وہ حسنِ معصوم جو کبھی دل میں بس رہا تھا قرار ہو کر

لپک رہا ہے شباب کی شوخیوں میں برق و شرار ہو کر

وہ دل کہ جس میں جلوہ فگن آرزو نہ ہو اک جام ہے کہ جس میں مئے مشکبو نہ ہو

یوں ایک ایک جام سے کیا ہوگا ساقیا! (۱۰۶) کیا لطف میکشی کا اگر ہاؤ ہو نہ ہو

گو تو نہیں ملا ہے مگر تیرے شوق میں (۱۰۷) یہ وقفۂ حیات تو اچھا گذر گیا

ایک ایک کر کے ہو گئیں شمعیں تمام گل (۱۰۸) تاریکیاں وہی ہیں شبِ انتظار کی

مثلِ بو روح بھی ہے غنچۂ ہستی میں اسیر (۱۰۹) موت کیا شے ہے؟ اسی بو کا صبا ہو جانا

وہ مست میکدۂ عشق کا ہوں صہبائی (۱۱۰) کہ جامِ زہر بھی پی کر مجھے سرور آیا!

ستا، ہاں خوب جی بھر کر ستا اے آسماں مجھ کو
حقارت سے ترے جور و ستم پر مسکرا دونگا
ترا آغوش اک راحت کدہ ہے جانِ مضطر کا (۱۱۱)
دعائیں عمر بھر تجھ کو میں اے بادِ صبا دونگا

مری تخیل کی رنگینیاں ہیں صبحِ خنداں میں (۱۱۲) مری ناکامیوں کی ظلمتیں ہیں شامِ ہجراں میں

تسکیں نہ ہو سکی دلِ وحشت پسند کی
منزل پہ سوچتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
نقشِ امید کی ہے جھلک رنگِ یاس میں (۱۱۳)
تاریکیوں میں دیکھ رہا ہوں سحر کو میں!

اثر اب کیا کہوں کیا کچھ مرے دل پر گزرتی ہے (۱۱۴) دعا ہے مانگتا ہوں رات بھر خوابِ پریشاں کی

حسنِ خواب آگیں پہ چاندنی برستی ہے (۱۱۵) جذب ہو گئیں نظریں اس حسیں منظر میں

دل میں نہ کاہشیں تھیں عذابِ ثواب کی
سرمستیاں عجیب تھیں عہدِ شباب کی
روزِ ازل سے برقِ طپاں کی نظر میں تھی (۱۱۶)
جو شاخ آشیاں کیلئے انتخاب کی

منظرِ ہستی کو جب تک دیکھئے بیگانہ ہے (۱۱۷) بند کر لیں آنکھ تو اپنا ہی خلوت خانہ ہے

اب حسن بے نقاب ہے یا نقاب پوش (۱۱۸) اب ہو چکا قرار دلِ بیقرار کو!!

تاریک تر ہے شام مری شیوۂ ہجر میں! میری سحر میں جلوۂ رنگِ سحر نہیں

(۱۱۹) معذور ہے جو مجھ کو بُرا جانتا ہے شیخ اسرارِ کائنات پر اس کی نظر نہیں

مسکراتا ہوا جب کوئی حسیں آتا ہے (۱۲۰) اے خدا تیری بھی ہستی کا یقیں آتا ہے

مرے بغیر رہا دامنِ نظر بے رنگ (۱۲۱) اگرچہ پھول تو اس نے چمن چمن کے لئے

آؤ اس درد کا اس طرح مداوا کر لیں (۱۲۲) خوابِ ہستی کو اک آخر خوابِ تمنا کر لیں

اس کا جمال دیکھا اور بار بار دیکھا (۱۲۳) مدہوش تھیں نگاہیں بے اختیار دیکھا

دل کے ویرانے میں سنّاٹا سا ناتا ہے مسکراؤ تو ابھی بزم چراغاں ہو جائے

(۱۲۴) آہ سینے میں ہی رہ جائے تو ہے شمعِ حیات اور اگر لب سے نکل جائے دھواں ہو جائے

آہ! کیا کیا آرزوئیں نذرِ حرماں ہو گئیں!! (۱۲۵) روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے!

اک درد ہو تو اس کا مداوا کرے کوئی (۱۲۶) جب زندگی ہی درد ہو پھر کیا کرے کوئی!

منیجر آزاد بکڈپو شہر سیالکوٹ

نے

اقبال برقی پریس سیالکوٹ

سے چھپوا کر شایع کیا

کتبہ

ایم عبدالرشید ممتاز رقم

مینجر آزاد بکڈپو شہر سیالکوٹ
نے

اقبال برقی پریس سیالکوٹ

سے چھپوا کر شایع کیا

کتبہ

ایم عبدالرشید ممتاز رقم